جلد ۹۳ جون ۱۹۸۰ء عدد ۴

ماہنامہ

ترجمان القرآن

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۹۳ | جون ۱۹۸۰ء مطابق رجب ۱۴۰۰ھ | عدد ۴

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۱۰۱۶ ——— ۴۱۰۳۱۶

زرِ سالانہ بیس روپے - فی پرچہ -/۲ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

پرنٹر: سید حسین فاروق مودودی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جو سلسلۂ گفتگو پیچھے سے چلا آرہا ہے، اسی کے تحت کچھ باتیں اور!

ایک قابلِ غور سوال یہ ہے کہ پچھلے دس یا پندرہ برس میں ہمارے اندر کیا تغیرات واقع ہوئے ہیں؟ یعنی اوّلاً ذاتی دائرے میں —— طرزِ فکر کے لحاظ سے، دلچسپیوں کی ترتیب کے لحاظ سے، سرگرمیوں کے محور کے لحاظ سے، دعوتی اور معاشی کاموں میں توازن کے لحاظ سے، عاداتِ مطالعہ کے لحاظ سے، معاشرتی مرتبے کے لحاظ سے، آسائش پسندی کے لحاظ سے، وھلمّ جرّا! اسی طرح اجتماعی دائرے میں۔

ہماری پسند و ناپسند کے معیارات میں فرق تو نہیں آیا؟ کچھ ایسی چیزیں تو نہیں جن کے لیے ہم کل تک دینی بنیادوں پر بڑا زور دیتے تھے اور اب ڈھیلے پڑ گئے ہیں؟ کچھ ایسی چیزیں تو نہیں جن کو کل ہم برداشت کرنے کو تیار نہ تھے - اور اب یکایک انہوں نے ہماری زندگی میں جگہ بنالی ہے؟ ہمارا بنیادی رویّہ یہ تھا کہ ہر شخص اِس کی کد میں تھا کہ زندگی میں ناجائز عناصر کیا کیا اور کہاں کہاں ہے تاکہ اس سے جلد نجات پائی جائے۔ سوال یہ ہے کہ آیا ہم سب میں یا ہماری غالب اکثریت میں یہی رویّہ کام کر رہا ہے یا اب یہ نقطۂ نظر بھی نمودار ہو رہا ہے کہ مفاد اور عادات جس شکل میں بھی زندگی کے نقشے میں جگہ پاچکے ہوں اُن کے لیے گنجائش جواز تلاش کی جائے؟

لوگوں سے میل جول، دعوتی رابطوں، افراد سے افہام و تفہیم کی گفتگوؤں، لٹریچر کی دست بدست اور خانہ بہ خانہ تقسیم کا معاملہ کیسا ہے؟ بات پہلے ہی کی طرح ہے یا کچھ فرق ہے؟

آپ کے مال میں سے انفاق فی سبیل اللہ کا تناسب کیا ہے؟ مساجد سے تعلق کتنا ہے؟ قرآن کی تلاوت اور اُسے سمجھنے کی کوشش کے ساتھ احادیث کا علم کس رفتار سے بڑھ رہا ہے؟ آپ کے معمول میں نمازوں اور دوسرے خاص اوقات کی دُعاؤں اور اذکار میں سے کیا کیا اپنی جگہ قائم ہے! کچھ مدت پہلے کے مقابلے میں اضافہ ہوا ہے یا کمی؟

یہ احتساب (STOCK TAKING) روزانہ بھی ہونا چاہیے، کسی خاص مہاتی دَور کے بعد بھی، اور کبھی کبھار کئی برس کا جائزہ اکٹھا بھی لینا چاہیے۔

اس خاموش خود تنقیدی سے آدمی کو اپنے بہت سے اسرار کا پتہ چل جاتا ہے۔ ضعف واستقامت کا اثر ہو تو وہ معلوم ہو جاتا ہے، تاب وتواں میں اضافہ ہوا ہو تو اُسے بھی آدمی جان لیتا ہے۔ بہت سی خود فریبیوں سے نکل آتا ہے، اور اگر وہ چاہے تو اپنی داعیانہ شخصیت کی ٹوٹ پھوٹ کی وقتاً فوقتاً تھوڑی بہت مرمت کر کے مضبوطی حاصل کر لیتا ہے۔

خدا پرست آدمی کو ہمیشہ اپنی گھات لگائے رکھنا چاہیے۔ اپنے باطن سے، اپنی نیتوں سے، اپنی عادات سے، اپنی دلچسپیوں سے، اپنی سرگرمیوں سے غفلت ویسا ہی نقصان دیتی ہے جیسے کوئی مالی اپنے چمن کی دیکھ بھال نہ کرے تو اُس کی کیاریاں خراب ہو جائیں گی، مینڈیں ٹوٹ پھوٹ جائیں گی۔ پودے اس بے ڈھنگ طریق سے بڑھیں گے کہ جنگل کا سماں ہو گا۔ بعض قیمتی اور نازک پودے سوکھ کر ختم ہو جائیں گے۔ مویشی اور پرندے شاخوں اور پھلوں اور پھولوں کا ستیاناس کر دیں گے۔ سبزہ بے گانہ ہو جائے گا اور جگہ جگہ زرسل سر اُٹھائیں گے۔

پس باہر کی دُنیا کے احوال کا معاملہ بعد میں آتا ہے۔ سچا خدا پرست اپنے اندر کی دُنیا کو درست اور صحت مند اور خوش آئند رکھتا ہے تو اُس کے نتیجے میں وہ باہر کی دُنیا سے بھی بخوبی نمٹ لیتا ہے۔ کہاوت ہے کہ "جان ہے تو جہان ہے"۔ مگر ایک مسلمان یوں سوچتا ہے کہ "ایمان ہے تو جہان ہے"۔ یہ جہان ہو کہ وہ جہان، دونوں میں خیر وخوبی اگر حاصل ہوتی ہے تو ایمان سے، ایمان نہیں تو سب کچھ ویران ہے اور عذابِ جان!

پارلیمانی سیاست کاری میں ساری توجہ حالات کے مدّوجزر پر ہوتی ہے۔ کون نیا درت پر آگیا ہے؟

کسے وزارت مل گئی ؟ کیا قوانین پاس ہو گئے ؟ ٹیکس کتنے لگا دیے گئے ؟ داخلی اور خارجہ پالیسیاں کیا ہیں ؟ وغیرہ۔

حکومتی گروہ، حکومتی اور قانونی اور مالیاتی تبدیلیوں کی توجیہہ کر کے بتاتا ہے کہ یہ فلاں فلاں وجوہ سے ضروری تھیں، اور اُن میں یہ یہ فوائد ہیں۔ دوسری طرف سے اپوزیشن ہر تبدیلی میں کوئی نہ کوئی خلل نکال کے دکھاتی ہے اور اُسے ہدفِ تنقید بناتی ہے بلکہ حکمران پارٹی پہ اچھے خاصے حملے کرتی ہے۔

اسلامی دعوت و تحریک بھی ضرورت پڑنے پر پارلیمانی مشغلہ اختیار کر لیتی ہے ——— حکومتی سطح پر یا اپوزیشن کی سطح پر۔ مگر وہ اپنے اصول و مقاصد کو برتر رکھ کر سوچتی ہے۔ نہ حکومت کی اندھی حمایت، نہ اپوزیشن کے دوسرے عناصر کی ہر بات پہ آمین۔ اسی طرح حکومت کی مجنونانہ مخالفت نہ اپوزیشن والوں کی حمد و ثنا اور تائید۔ اُدھر کوئی بھلائی ہو تو اُس کا اعتراف، اِدھر صحیح اقدام ہو تو اِدھر تحسین۔ اسی طرح اُس سطح پر غلط کام ہوں تو اُن کے خلاف احتجاج، اور اس سطح پر غلط آراء یا منصوبے سامنے آئیں تو ان سے اختلاف و براءت۔

بہر حال پارلیمانی سیاست واقعاتی مدّوجزر کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔

لیکن اسلامی دعوت ہر قسم کے واقعاتی مدّوجزر سے قطع نظر، اور ہر قسم کے واقعاتی مدّوجزر کے ساتھ ساتھ رواں رہتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ پچھلے ادوار میں ہماری توجہات کو واقعاتی مدّوجزر نے اپنی طرف اس درجہ منعطف کیے رکھا ہے کہ ہماری ساری گفتگوئیں، بیانات، اعلانات، خط و کتابت انہی کے حوالے سے ہوتی رہی ہے اور انہی کے حل اور توڑ سوچے جاتے رہے ہیں۔ متوازی طور پہ جو زور کار دعوت پر دیا جانا تھا وہ نہیں دیا جا سکا ہے۔

یہ فرق اس حقیقت سے واضح ہو سکے گا کہ پہلے ادوار میں ہم اپنی اصل دعوت زور دے کر تفصیل سے پیش کرتے تھے اور لوگ اس سے متاثر ہوتے تھے، پھر ہم اس کے تقاضوں کو احوال و مقامات پر منطبق کر کے بتلاتے تھے کہ کس معاملے میں کیا ہونا چاہیے۔ اب نئے ادوار میں ہم کسی وقتی صورتِ حالات کو اصل مدارِ بحث بنا کر سوچتے اور بات کرتے ہیں اور اس کے متعلق دعوت اور اس کے

تقاضوں کو بغیر کسی وضاحت کے اپنے ہی ذہن میں منطبق کر کے اور اُس کے نتائج نکال کر اظہار خیال کر دیتے ہیں۔ یعنی اب ہمارا طریقہ لوگوں کو اسلام کی اصل دعوت کی طرف کھینچنے کا نہیں، بلکہ وقت کے مسائل اور اُن کے حل کی طرف کھینچنے کا ہے۔ ہم یہ تو کہتے ہیں کہ فلاں چیز ہو جائے تو اسلام کا عَلَم بلند ہوگا اور فلاں کو رد کیا جائے تو اسلام کو نقصان پہنچے گا۔ مگر اب ہم اسلام کی اساسی تعلیم کو لوگوں میں ایسے طریق سے نہیں پھیلاتے کہ وہ خود یہ بات سمجھنے کے قابل ہو جائیں کہ اسلام کی قوت کس صورت میں ہے اور اس کا ضعف کس صورت میں۔

میرا کہنا یہ ہے کہ پارلیمانی سیاست ہو (جس کا فی الحال نا طقہ بند ہے) یا وقتی حالات کے متعلق غیر پارلیمانی طرز کا تعرض، یہ اسلامی تحریک کے ضمنی مشاغل ہو سکتے ہیں جن کا اصل مدعا دعوت ہی کے لیے نئے میدان پیدا کرنا اور اُسے تقویت دینا ہوتا ہے۔ ہر قسم کے واقعاتی مدوجزر کے دوران میں ہماری اصولی دعوتِ اسلام ٹھیک اسی طرح جاری رہنی چاہیے۔ جیسے پہلے تھی۔ یعنی معلمانہ طریق سے لوگوں تک اسلامی تعلیمات کو مؤثر انداز میں پہنچانا، اُن کو دل سے دینی حقائق کا قائل کرنا، اُن کے باطن میں اسلامی نقشے پر تبدیلی کا رضا کارانہ جذبہ پیدا کرنا اور اُن کے اندر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اسپرٹ اُبھارنا، اُن کو تعاون علی البر اور عدم تعاون علی الاثم کے ذوق سے مالا مال کرنا اور اُن کو غلبۂ دین کی جدوجہد کا سپاہی بنا دینا۔ یہ ہے کارِ دعوت۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ہم اس بنیادی کام میں اپنے ہدف سے پیچھے نہ رہ گئے ہوں۔ اور رفتار کے لحاظ سے سست گام نہ ہو گئے ہوں۔

میرے نزدیک کفار کا دیس ہو کہ مسلمانوں کا، سیاسی دور ہو یا غیر سیاسی، حالتِ جنگ ہو یا حالتِ امن، اساسی دعوت ہر حالت میں جاری رہنی چاہیے۔

اگلے دن میں ایک تقریر سُن رہا تھا۔ چند روز بعد ایک اور تقریر سُنی۔ دونوں تقریریں مختصر پرائیویٹ سی مجالس میں ہوئیں۔ اس غیر سیاسی دور میں اگر آلوؤں کی کاشت پر، یا عالمی یومِ اطفال کے متعلق بھی کوئی تقریر سُننے کا موقع مل جائے تو ایسا ہی ہے جیسے سُوکھے میں کوئی چھوٹی سی بدلی یکایک نمودار ہو اور چار چھینٹے ڈال جائے۔

دونوں تقریروں میں دینی جذبات کی جھلک نمایاں تھی۔ مگر دونوں کا رُوئے سخن احوالِ زمانہ

کی لہروں کی طرف تھا۔ ایک میں جوش بہت زیادہ تھا۔ مگر ہوش بس اس حد تک جتنا چائے کی پیالی میں دُودھ ہوتا ہے۔ دوسری میں جوش بھی بہت زیادہ تھا اور ہوش بھی خاصا! دونوں کی قدر مشترک پر زور جوشیلا پن تھا۔

جوشیلی بات کے لیے الفاظ بھی خاص طرح کے چاہییں، اور لہجہ بھی مناسب اسلوب کا۔ یہ دونوں خوبیاں دونوں طرف موجود تھیں۔

بالعموم جوشیلے الفاظ اور جوشیلے لہجے کو قوت کی علامت سمجھا جاتا ہے، حالانکہ جوشیلی تقریریں ہوں یا جلسے یا جلوس یا پوسٹر یا بیانات، یہ ساری چیزیں اظہارِ قوت یا نمائشِ قوت کی تعریف میں آتی ہیں۔

اظہارِ قوت اور نمائشِ قوت کا بھی ایک خاص اثر ہوتا ہے، مگر اصل اثر آفریں چیز خود قوت ہے۔ نمائشِ قوت سے اپنے آپ کو اور دوسروں کو مغالطے دیے جا سکتے ہیں اور کسی معرکہ مسلسل میں جزوی طور پر کبھی مغالطہ انگیزی بھی فائدہ دے جاتی ہے۔ مگر فی الحقیقت مستقل دار و مدار اصل قوت پر ہوتا ہے کہ وہ کتنی ہے؟

دین کی بات ہو یا سیاست کی، اصولاً قوت اُس اثر کا نام ہے جو کسی دعوت یا پروگرام میں پایا جاتا ہو۔ کتنے لوگ اُسے سمجھتے ہیں، کتنے پوری طرح سمجھ کر اُسے قبول کر چکے ہیں؟ کتنے اُس کا تھوڑا بہت اثر لے کر اُس کی حمایت کرتے ہیں؟ پیغام دینے والوں کو کتنے لوگ جانتے ہیں اور اُن سے محبت کرتے ہیں؟ پکارا جائے تو کتنے لبیک کہتے ہیں؟ تعاون کی ضرورت ہو تو کتنے اپنی قوتوں، اوقات اور اموال کی قربانیاں خوشی خوشی دیتے ہیں؟ کتنے کس کام کو اپنا کام سمجھتے ہیں اور کسی حلقے کو اپنا حلقہ مانتے ہیں؟ دن رات کی گفتگوؤں اور بحثوں میں کتنے لوگ مخالفین کو دلائل سے قائل کرنے یا اُن کے اعتراضات کے جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں؟ اور ایسے لوگ معاشرے کے مختلف اداروں اور دفتروں اور پیشوں میں کس تناسب سے پائے جاتے ہیں؟

اس معیار پر حقیقی قوّت جتنی موجود ہو اُس کو اگر محض جوشیلے پن یا فرسٹریشن کے ذریعے دس گنا زیادہ کر کے پیش کیا جائے تو یہ بڑا بھاری عدم توازن ہے۔ دُنیا میں اگر کوئی سعی و جہد کرتے ہوئے آدمی اس عدم توازن سے کام لے تو سارا کام خراب ہو جائے گا۔

مختصر بات یہ ہے کہ دعوتوں، نظریوں اور تحریکوں کی اصل قوت اساسی سرمائے کی طرح ہوتی ہے اور اس کے مظاہر گویا اس سرمائے سے پیدا ہونے والی کاروباری سرگرمی کے مترادف ہیں۔ بڑی غلط صورت ہوگی، اگر کسی نظریے کے علمبردار اپنے حقیقی سرمائے میں اضافہ کرنے پر تو بہت کم توجہ دیتے ہوں، اور مارکیٹ میں یہ دکھانے کی کوشش کریں کہ ہم ارب پتی ہیں۔ حقیقی سرمایہ تو وہ وہی رہے جو دس برس پہلے تھا، اور بازار کی مسابقت مجبور کر دے کہ کاروباری سرگرمی پہلے سے بہت زیادہ دکھائی جائے تو بزنس مین کس بحران سے دوچار ہو جائے گا۔ کاش کہ بازارِ حق کا بزنس مین بہت زیادہ فکر اپنے حقیقی سرمایے میں اضافے کی کرے۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ معاشرے میں ہمہ گیر تبدیلی جب آتی ہے تو خواہ وہ انتخابی راستے سے آئے یا انقلابی (یعنی ہجومی سیاست) کے راستے سے، وہ ہمیشہ حقیقی قوت کے معیارِ مطلوب تک پہنچ جانے کی صورت میں آتی ہے۔ بغیر اس کے آ بھی جائے تو اس کے برگ و بار بدل جاتے ہیں۔

خالص نظریاتی بات یہ ہے کہ سیاست، جو بجائے خود ضروری ہے، ایک طرح کی محاذ آرائی ہوتی ہے۔ ہم خیال لوگ ایک طرف اور مخالفین ایک طرف۔ دونوں طرف سے بیان بازی، دونوں طرف سے جوڑ توڑ، دونوں طرف سے چالیں اور اُن کی کاٹ۔ اس مشغلے کا مزاج جنگی ہے۔ سیاست کے اسٹیج سے آدمی نرم اور ڈھیلی ڈھالی بات نہیں کر سکتا۔ وہ اس طرح کا انداز اختیار نہیں کر سکتا کہ "ممکن ہے غلطی ہماری ہو، مگر ہمیں صحیح یہی محسوس ہوتا ہے"۔ کھینچا تانی جب بڑھتی ہے تو نفرت کی اسپرٹ کام کرنے لگتی ہے۔ آپ سیاسی اسٹیج سے جسے حریف قرار دے کر اُس پہ گولہ باری کرتے ہیں، پھر اسی سیاسی اسٹیج سے اُسے دلگداز انداز میں دعوتِ اسلامی نہیں دے سکتے، دیں بھی تو عبث ہے۔

بخلاف اس کے دعوتِ حق کی رُوح محبت و خیر خواہی ہے وہ ابرِ رحمت کی مانند عام ہے، اس کا مخاطب ہر کوئی ہے، خواہ وہ کسی پارٹی سے تعلق رکھتا ہو، خواہ وہ مخالف و معاند ہی کیوں نہ ہو۔ دعوت کی بات الیکشن کی طرح دو ٹوک نہیں ہوتی کہ مخاطب فلاں تاریخ تک اِدھر یا اُدھر ہونے کا فیصلہ کر لے بلکہ دعوت کا عمل تادیر آہستہ آہستہ جاری رہتا ہے۔ ایک آدمی کے سامنے

سب جتنی بات کرنی چاہیے، اُتنی کی جاتی ہے۔ بقیہ گفتگو کے لیے دوسرا موزوں لمحہ تلاش کیا جاتا ہے۔ ایک انداز گفتگو اگر کارگر نہ رہے تو دوسرا آزمایا جاتا ہے۔ قسط بہ قسط اثر اندازی کی کوشش ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ خدا فراموش لوگ از خود دستارہ کے لیے آنے لگتے ہیں۔ غلم بینوں کو درسِ قرآن میں شمولیت کا شوق ہو جاتا ہے۔ حرام خوار افراد رزقِ حلال کے لیے سرگرداں ہو جاتے ہیں۔ بے پردہ عورتوں میں از خود پردہ داری کا رجحان اُبھر آتا ہے۔ قاتل اور ڈاکو تائب ہو جاتے ہیں۔ لوگوں کی دلچسپیاں بدلنے لگتی ہیں۔ اُن کی دوستیوں اور دشمنیوں کے پیمانے تبدیل ہو جاتے ہیں جو لوگ نقیبانِ حق کو گالیاں دینے تھے وہ اُن کے لیے دُعائیں کرنے لگتے ہیں۔

کیا کارِ دعوت میں کچھ ایسے واقعات آپ کو پیش آئے؟ یا کسی دوسرے کے کام کے ایسے نتائج آپ نے دیکھے؟ کیا آج ایسے عجائبات پیدا کر دکھانے کا جذبہ آپ میں ہے؟

مَیں کہتا ہوں کہ سیکڑوں سیاسی کامیابیاں اور ہزاروں سیاسی فتوحات اِس جد و جہد پر قربان جس کے نتیجے میں خدا کے بندے، نفس اور ماحول کی قوتوں کی بندگی سے نکل کر صحیح معنوں میں خدا کے بندے بن جاتے ہیں۔ یہی اقامتِ دین کی جد و جہد کی اصل قوت ہوتے ہیں اور اس اصل قوت میں اضافہ کرنے کی مہم ہر قسم کے حالات میں جاری رہنی چاہیے۔

دین و سیاست کو جمع کرنے یا انتخابی اور دعوتی سرگرمیوں کو بیک وقت لے کے چلنے کا تجربہ اتنا مشکل ہے کہ ماضی میں ہمارے یہاں دونوں کاموں کے لیے دو دائروں میں الگ الگ قوتیں نمودار ہو گئی تھیں۔ ایک طرف بادشاہ، وزراء اور امراء تھے جو فوج کشی کر کے فتوحات کرتے اور سلطنتیں چلاتے تھے، دوسری طرف صوفیاء تھے جو ساری نزاعات سے کنارہ کش ہو کر تمام انسانوں کے لیے یکساں خیر خواہ بنتے اور اُن کو قبولِ اسلام اور اطاعتِ اسلام کے لیے تیار کرتے تھے۔ یہ اُن کی فتوحات تھیں۔

اب یا تو تھک ہار کر یہ کہیے کہ دونوں کام الگ الگ ہونے چاہییں یا دونوں کاموں کو بیک وقت کرنے میں جس بصیرت اور توازن اور محنت کی ضرورت ہے وہ اپنے اندر پیدا کیجیے۔

(باقی)

(گذشتہ سے پیوستہ)

تذکرۂ انبیاء

علیہم السلام

از

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور

باب اوّل ـــــ قصہ آدم علیہ السلام

فصل ۱۱ تا ۱۲

فصل ۱۱

انسان کے لیے تسخیرِ کائنات

خلافتِ آدمؑ سے مسئلہ تسخیرِ کائنات کا بہت قریبی تعلق ہے۔ اللہ کی طرف سے مخلوق کے لیے جو فرمانِ تسخیر ملا ہے، اس کے بغیر نیابت و خلافت کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اشیاء و موجودات اور طبیعی قوتوں کو ایسے قوانین کا پابند کیا گیا ہے اور ایسے حدود میں رکھا گیا ہے کہ وہ انسانی زندگی کے لیے سازگار اور مفید ہو سکیں اور ان قوانین و حدود کا علم حاصل کر کے انسان ان کو اپنے کام میں لا سکے۔ اگر انسان کے لیے کائنات کو اس طرح سازگار نہ بنایا جاتا اور موجودات اور قوتوں کو مسخر نہ کیا گیا ہوتا تو انسانی زندگی ہی ممکن نہ تھی، کجا کہ نیابتِ الٰہی کا فریضہ انجام دیا جائے۔ تسخیرِ کائنات کی بحث کا خلافتِ انسانی سے اتنا اہم تعلق ہے کہ قصۂ آدم کے ساتھ ایک ضمنی بحث کے طور پر اسے شامل کرنا ضروری تھا۔ (مرتبین)

آدم کے لیے فرمانِ تسخیر

طبقۂ کائنات میں جس قدر فرشتے مامور ہیں ان سب کو انسان کے لیے مطیع و مسخر ہو جانے کا حکم دیا گیا۔ چونکہ اس علاقے میں اللہ کے حکم سے انسان خلیفہ بنایا جا رہا تھا اس لیے فرمان جاری ہوا کہ صحیح یا غلط جس کام میں بھی انسان اپنے ان اختیارات کو، جو ہم اسے عطا کر رہے ہیں استعمال کرنا چاہے اور ہم اپنی مشیت کے تحت اُسے ایسا کر لینے کا موقع دے دیں تو تمھارا فرض ہے کہ تم میں سے جس جس کے دائرۂ عمل سے وہ کام متعلق ہو، وہ اپنے دائرے کی حد تک اس کا ساتھ دے۔ وہ چوری کرنا چاہے یا نماز پڑھنے کا ارادہ کرے، نیکی کرنا چاہے، یا بدی کے ارتکاب کے لیے جائے، دونوں صورتوں میں جب تک ہم اسے اس کی پسند کے مطابق عمل کرنے کا اذن دئے رہیں، تمھیں اس کے لیے سازگاری کرنی ہوگی۔ مثال کے طور پر،

اس کو یوں سمجھیے کہ ایک فرمانروا جب کسی شخص کو اپنے ملک کے کسی صوبے یا ضلع کا حاکم مقرر کرتا ہے تو اس علاقے میں حکومت کے جس قدر کارندے ہوتے ہیں ان سب کا فرض ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کریں۔ اور جب تک فرمانروا کا منشا یہ ہے کہ اسے اپنے اختیارات کے استعمال کا موقع دے اس وقت تک اس کا ساتھ دیتے رہیں۔ قطع نظر اس سے کہ وہ صحیح کام میں ان اختیارات کو استعمال کر رہا ہے، یا غلط کام میں۔ البتہ جب، جس کام کے بارے میں بھی فرمانروا کا اشارہ ہو جائے کہ اسے نہ کرنے دیا جائے، تو وہیں ان حاکم صاحب کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے۔ اور انھیں ایسا معلوم ہونے لگتا ہے کہ سارے علاقے کے اہل کاروں نے گویا ہڑتال کر دی ہے۔ حتیٰ کہ جس وقت فرمانروا کی طرف سے ان حاکم صاحب کی معزولی اور گرفتاری کا حکم ہوتا ہے تو وہی ماتحت و خدام جو کل تک ان کے اشاروں پر حرکت کر رہے تھے، ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال کر انھیں کشاں کشاں دارالفاسقین کی طرف لے جاتے ہیں۔ فرشتوں کو آدم کے لیے سربسجود ہو جانے کا جو حکم دیا گیا تھا اس کی نوعیت کچھ اسی قسم کی تھی۔ ممکن ہے کہ صرف مسخر ہو جانے ہی کو سجدہ سے تعبیر کیا گیا ہو۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اس انقیاد کی علامت کے طور پر کسی ظاہری فعل کا بھی حکم دیا گیا ہو اور یہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔

انسان کے لیے کائنات کو کس معنی میں مسخر کیا گیا ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهٖ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْاَنْهٰرَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۝ (ابراھیم۔ آیات ۳۲-۳۳)

"جس نے کشتی کو تمھارے لیے مسخر کیا کہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے اور دریاؤں کو تمھارے لیے مسخر کیا، جس نے سورج اور چاند کو تمھارے لیے مسخر کیا جو لگاتار چلے جا رہے ہیں اور رات اور دن کو تمھارے لیے مسخر کیا۔"

"تمھارے لیے مسخر کیا" کو عام طور پر لوگ غلطی سے "تمھارے تابع کر دیا" کے معنی میں لے لیتے ہیں، اور پھر اس مضمون کی آیات سے عجیب عجیب معنی پیدا کرنے لگتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعض لوگ تو یہاں تک سمجھ بیٹھے ہیں کہ ان آیات کی رو سے تسخیر سماوات و ارض انسان کا منتہائے مقصود ہے۔ حالانکہ انسان کے لیے ان چیزوں کو مسخر کرنے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایسے قوانین کا پابند بنا رکھا ہے جن کی بدولت وہ انسان کے لیے نافع ہو گئی ہیں۔ کشتی اگر فطرت کے چند مخصوص قوانین کی پابند نہ ہوتی تو انسان کبھی بحری سفر نہ کر سکتا۔ دریا اگر مخصوص قوانین میں جکڑے ہوئے نہ ہوتے تو کبھی ان سے نہریں نہ نکالی جا سکتیں۔ سورج

و چاند اور روز و شب اگر ضابطوں میں کسے نہ ہوتے تو یہاں کی زندگی ہی ممکن نہ ہوتی کجا کہ ایک پھلتا پھولتا انسانی تمدن وجود میں آسکتا۔

وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝

(النحل - آیت ۱۴)

وہی ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کر رکھا ہے تاکہ تم اس سے ترو تازہ گوشت لے کر کھاؤ اور اس سے زینت کی وہ چیزیں نکالو جنھیں تم پہنا کرتے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ کشتی سمندر میں سینہ چیرتی ہوئی چلتی ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکر گزار بنو۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ۔

(الحج - آیت ۶۵)

کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اس نے وہ سب کچھ تمہارے لیے مسخر کر رکھا ہے جو زمین میں ہے، اور اسی نے کشتی کو قاعدے کا پابند بنایا ہے کہ وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے اور وہی آسمان کو اس طرح تھامے ہوئے ہے کہ اس کے اذن کے بغیر وہ زمین پر نہیں گر سکتا۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ۔

(لقمٰن - آیت ۲۰)

کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لیے مسخر کر رکھی ہیں۔

کسی چیز کو کسی کے لیے مسخر کرنے کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ چیز اس کے تابع کر دی جائے اور اسے اختیار دے دیا جائے کہ جس طرح چاہے اس میں تصرف کرے اور جس طرح چاہے اسے استعمال کرے۔ دوسرے یہ کہ اس چیز کو ایسے ضابطہ کا پابند کر دیا جائے جس کی بدولت وہ اس شخص کے لیے نافع ہو جائے اور اس کے مفاد کی خدمت کرتی رہے۔ زمین و آسمان کی تمام چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے انسان کیلئے ایک ہی معنی میں مسخر نہیں کر دیا ہے، بلکہ بعض چیزیں پہلے معنی میں مسخر کی ہیں اور بعض دوسرے معنی میں۔ مثلاً ہوا، پانی، مٹی، آگ، نباتات، معدنیات، مویشی وغیرہ بے شمار چیزیں پہلے معنی میں ہمارے لیے مسخر ہیں، اور چاند، سورج وغیرہ دوسرے معنی میں۔

فصل ۱۲

انسانی زندگی کے لیے سازگار ماحول کی فراہمی

أَمَّنْ جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا وَجَعَلَ	اور وہ کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا اور
خِلَالَهَا أَنْهَارًا وَجَعَلَ لَهَا رَوَاسِيَ	اس کے اندر دریا رواں کیے اور اس میں (پہاڑوں
وَجَعَلَ بَيْنَ الْبَحْرَيْنِ حَاجِزًا	کی) میخیں گاڑ دیں اور پانی کے دو ذخیروں کے درمیان
(النمل - آیت ۶۱)	پردے حائل کر دیے۔

زمین کا اپنی بے حد و حساب مختلف النوع آبادی کے لیے جائے قرار ہونا بھی کوئی سادہ سی بات نہیں ہے۔ اس کرۂ خاکی کو جن حکیمانہ مناسبتوں کے ساتھ قائم کیا گیا ہے ان کی تفصیلات پر آدمی غور کرے تو اس کی عقل دنگ رہ جاتی ہے اور اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ مناسبتیں ایک حکیم و دانا قادرِ مطلق کی تدبیر کے بغیر قائم نہ ہو سکتی تھیں۔ یہ کرہ فضائے بسیط میں معلق ہے، کسی چیز پر ٹکا ہوا نہیں ہے مگر اس کے باوجود اس میں کوئی اضطراب و اہتزاز نہیں ہے۔ اگر اس میں ذرا سا بھی اہتزاز ہوتا جس کے خطرناک نتائج کا ہم کبھی زلزلہ آ جانے سے بآسانی اندازہ لگا سکتے ہیں تو یہاں کوئی آبادی ممکن نہ تھی۔

یہ کرہ باقاعدگی کے ساتھ سورج کے سامنے آتا اور چھپتا ہے جس سے رات اور دن کا اختلاف رونما ہوتا ہے۔ اگر اس کا ایک ہی رخ ہر وقت سورج کے سامنے رہتا اور دوسرا رخ ہر وقت چھپا رہتا تو یہاں کوئی آبادی ممکن نہ ہوتی کیونکہ ایک رخ کو سردی اور بے نوری نباتات اور حیوانات کی پیدائش کے قابل نہ رکھتی اور دوسرے رخ کو گرمی کی شدت بے آب و گیاہ اور غیر آباد بنا دیتی۔ اس کرہ پر پانچ سو میل کی بلندی تک ہوا کا ایک کثیف ردا چڑھا دیا گیا ہے جو شہابوں کی خوفناک بم باری سے اسے بچائے ہوئے ہے۔ روزانہ دو کروڑ شہاب جو ۳۰ میل فی سیکنڈ کی رفتار سے زمین کی طرف گرتے ہیں، یہاں وہ تباہی مچاتے کہ کوئی انسان، حیوان یا درخت جیتا نہ رہ سکتا تھا۔ یہی ہوا درجۂ حرارت کو قابو میں رکھتی ہے، یہی سمندروں سے بادل اٹھاتی اور

زمین کے مختلف حصوں تک آب رسانی کی خدمت انجام دیتی ہے۔ اور یہی انسان اور حیوان اور نباتات کی زندگی کو مطلوب گیسیں فراہم کرتی ہے۔ یہ نہ ہوتی تب بھی زمین کسی آبادی کے لیے جائے قرار نہ بن سکتی۔ اس کُرے کی سطح سے بالکل متصل وہ معدنیات اور مختلف قسم کے کیمیاوی اجزاء بڑے پیمانے پر فراہم کر دیے گئے ہیں جو نباتی، حیوانی اور انسانی زندگی کے لیے مطلوب ہیں۔ جس جگہ بھی یہ سروسامان مفقود ہوتا ہے وہاں کی زمین کسی زندگی کو سہارنے کے لائق نہیں ہوتی۔ اس کُرے پر سمندروں، دریاؤں، جھیلوں، چشموں اور زیرِ زمین سوتوں کی شکل میں پانی کا بڑا عظیم الشان ذخیرہ فراہم کر دیا گیا ہے اور پہاڑوں پر بھی اس کے بڑے بڑے ذخائر کو منجمد کرنے اور پھر پگھلا کر بہانے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔ اس تدبیر کے بغیر یہاں کسی زندگی کا امکان نہ تھا۔

پھر اس پانی، ہوا اور ان تمام اشیاء کو جو زمین پر پائی جاتی ہیں، سمیٹے رکھنے کے لیے اس کُرے میں نہایت ہی مناسب کشش رکھ دی گئی ہے۔ یہ کشش اگر کم ہوتی تو ہوا اور پانی، دونوں کو نہ روک سکتی اور درجۂ حرارت اتنا زیادہ ہوتا کہ زندگی یہاں دشوار ہو جاتی۔ یہ کشش اگر زیادہ ہوتی تو ہوا بہت کثیف ہو جاتی، اس کا دباؤ بڑھ جاتا۔ بخاراتِ آبی کا اٹھنا مشکل ہوتا اور بارشیں نہ ہو سکتیں، سردی زیادہ ہوتی، زمین کے بہت کم رقبے آبادی کے قابل ہوتے، بلکہ کششِ ثقل بہت زیادہ ہونے کی صورت میں انسان اور حیوانات کی جسامت بہت کم ہوتی اور ان کا وزن اتنا زیادہ ہوتا کہ نقل و حرکت بھی ان کے لیے مشکل ہوتی۔ علاوہ بریں، اس کُرے کو سورج سے ایک خاص فاصلے پر رکھا گیا ہے جو آبادی کے لیے مناسب ترین ہے۔ اگر اس کا فاصلہ زیادہ ہوتا تو سورج سے اس کو حرارت کم ملتی، سردی زیادہ ہوتی، موسم بہت لمبے ہوتے، اور مشکل ہی سے یہ آبادی کے قابل ہوتا۔ اگر فاصلہ کم ہوتا تو اس کے برعکس گرمی کی زیادتی اور دوسری بہت سی چیزیں مل کر اسے انسان جیسی مخلوق کی سکونت کے قابل نہ رہنے دیتیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ	وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے زمین
قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً۔	کو جائے قرار بنایا اور اوپر آسمان کا گنبد
(المومن۔ آیت ۶۴)	بنا دیا۔

یعنی تمھیں کھلی فضا میں نہیں چھوڑ دیا گیا کہ عالمِ بالا کی آفات بارش کی طرح برس کر تم کو تہس نہس کر دیں، بلکہ زمین کے اوپر ایک نہایت مستحکم سماوی نظام (جو دیکھنے والی آنکھ کو گنبد کی طرح نظر آتا ہے) تعمیر کر دیا۔ جس سے گزر کر کوئی تباہ کن چیز تم تک نہیں پہنچ سکتی، حتیٰ کہ آفاق کی مہلک شعاعیں تک نہیں پہنچ سکتیں۔

اور اسی وجہ سے تم امن و چین کے ساتھ زمین پر جی رہے ہو۔

یہ صرف چند وہ مناسبتیں ہیں جن کی بدولت زمین اپنی موجودہ آبادی کے لیے جائے قرار بنی ہے۔ کوئی شخص عقل رکھتا ہو اور ان امور کو نگاہ میں رکھ کر سوچے تو وہ ایک لمحہ کے لیے بھی نہ یہ تصور کر سکتا ہے کہ کسی خالق حکیم کی منصوبہ سازی کے بغیر یہ مناسبتیں محض ایک حادثہ کے نتیجے میں خود بخود قائم ہو گئی ہیں، اور نہ یہ گمان کر سکتا ہے کہ اس عظیم الشان تخلیقی منصوبے کو بنانے اور روبعمل لانے میں کسی دیوی دیوتا، یا جن یا ولی، یا فرشتے کا کوئی دخل ہے۔

سورج اور زمین

وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ۔ (یٰس ۔ آیت ۳۸)	اور سورج وہ اپنے ٹھکانے کی طرف چل رہا ہے۔ یہ زبردست علیم ہستی کا باندھا ہوا حساب ہے۔

رات اور دن کی آمد و رفت بھی انہی پیش افتادہ حقائق میں سے ہے جنھیں انسان محض اس بنا پر کہ وہ معمولاً دنیا میں پیش آ رہے ہیں، کسی التفات کا مستحق نہیں سمجھتا۔ حالانکہ اگر وہ اس بات پر غور کرے کہ دن کیسے گزرتا ہے اور رات کس طرح آتی ہے، اور دن کے جانے اور رات کے آنے میں کیا حکمتیں کارفرما ہیں تو اسے خود محسوس ہو جائے کہ یہ ایک رب قدیر و حکیم کے وجود اور اس کی یکتائی کی روشن دلیل ہے۔ دن کبھی نہیں جا سکتا اور رات کبھی نہیں آ سکتی جب تک زمین کے سامنے سے سورج نہ ہٹے۔ دن کے ہٹنے اور رات کے آنے میں جو انتہائی باقاعدگی پائی جاتی ہے وہ اس کے بغیر ممکن نہ تھی کہ سورج اور زمین کو ایک ہی اٹل ضابطہ نے جکڑ رکھا ہو۔ پھر اس رات اور دن کی آمد و رفت کا جو گہرا تعلق زمین کی مخلوقات کے ساتھ پایا جاتا ہے وہ اس بات پر صاف دلالت کرتا ہے کہ کسی نے یہ نظام کمال درجے کی دانائی کے ساتھ بالارادہ قائم کیا ہے۔ زمین پر انسان اور حیوان اور نباتات کا وجود، بلکہ یہاں پانی اور ہوا اور مختلف معدنیات کا وجود بھی دراصل نتیجہ ہے اس بات کا کہ زمین کو سورج سے ایک خاص فاصلے پر رکھا گیا ہے، اور پھر یہ انتظام کیا گیا ہے کہ زمین کے مختلف حصے تسلسل کے ساتھ مقرر وقفوں کے بعد سورج کے سامنے آتے اور اس کے سامنے سے ہٹتے رہیں۔ اگر زمین کا فاصلہ سورج سے بہت کم یا بہت زیادہ ہوتا، یا اس کے ایک حصے پر ہمیشہ رات رہتی اور دوسرے حصہ پر ہمیشہ دن رہتا، یا شب و روز کا الٹ پھیر بہت تیز یا بہت سست ہوتا، یا بے قاعدگی کے ساتھ اچانک کبھی دن

نکل آتا اور کبھی رات چھا جاتی، تو ان تمام صورتوں میں اس کرّے پر کوئی زندگی ممکن نہ ہوتی، بلکہ غیر زندہ مادّوں کی شکل و ہیئت بھی موجودہ شکل سے بہت مختلف ہوتی۔ دل کی آنکھیں بند نہ ہوں تو آدمی اس نظام کے اندر ایک ایسے خدا کی کارفرمائی صاف دیکھ سکتا ہے جس نے اس زمین پر اس خاص قسم کی مخلوقات کو وجود میں لانے کا ارادہ کیا اور ٹھیک ٹھیک اس کی ضروریات کے مطابق زمین اور سورج کے درمیان یہ نسبتیں قائم کیں۔ (۹۱)

ٹھکانے سے مراد وہ جگہ بھی ہو سکتی ہے جہاں جا کر سورج کو آخر کار ٹھیر جانا ہے اور وہ وقت بھی ہو سکتا ہے جب وہ ٹھیر جائے گا۔ اس آیت کا صحیح مفہوم انسان اسی وقت متعین کر سکتا ہے جب کہ اسے کائنات کے حقائق کا ٹھیک ٹھیک علم حاصل ہو جائے۔ لیکن انسانی علم کا حال یہ ہے کہ وہ ہر زمانہ میں بدلتا رہا ہے اور آج جو کچھ اسے بظاہر معلوم ہے اس کے بدل جانے کا ہر وقت امکان ہے۔ سورج کے متعلق قدیم زمانے کے لوگ عینی مشاہدے کی بنا پر یہ یقین رکھتے تھے کہ وہ زمین کے گرد چکّر لگاتا ہے۔ پھر مزید تحقیق و مشاہدہ کے بعد یہ نظریہ قائم کیا گیا کہ وہ اپنی جگہ ساکن ہے اور نظامِ شمسی کے سیّارے اس کے گرد گھوم رہے ہیں۔ لیکن یہ نظریہ بھی مستقل ثابت نہ ہوا۔ بعد کے مشاہدات سے پتہ چلا کہ نہ صرف سورج بلکہ وہ تمام تارے جن کو ثوابت (FIXED STARS) کہا جاتا ہے ایک رخ پر چلے جا رہے ہیں۔ ثوابت کی رفتار کا اندازہ ۱۰ میل سے لے کر ۱۰۰ میل فی سکنڈ تک کیا گیا ہے اور سورج کے متعلق موجودہ زمانہ کے ماہرینِ فلکیات کہتے ہیں کہ وہ اپنے پورے نظامِ شمسی کو لیے ہوئے ۲۰ کیلو میٹر (تقریباً ۱۲ میل) فی سکنڈ کی رفتار سے حرکت کر رہا ہے۔ (ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، لفظ "اسٹار")

چاند کی گردش

وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ۔ (یٰس۔ آیت ۳۹)	چاند، اس کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ ان سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے۔

یعنی مہینے کے دوران میں چاند کی گردش ہر روز بدلتی رہتی ہے۔ ایک دن وہ ہلال بن کر طلوع ہوتا ہے پھر روز بروز بڑھتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ چودھویں رات کا بدرِ کامل بن جاتا ہے۔ اس کے بعد روز گھٹتا چلا جاتا ہے حتیٰ کہ آخر کار پھر اپنی ابتدائی ہلالی شکل پر واپس پہنچ جاتا ہے۔ یہ چکر لاکھوں برس سے پوری باقاعدگی کے ساتھ چل رہا ہے اور چاند کی ان مقرر منزلوں میں کبھی فرق نہیں آتا۔ اسی وجہ سے انسان

حساب لگا کر ہمیشہ یہ معلوم کر سکتا ہے کہ کس روز چاند کس منزل میں ہوگا۔ اگر اس کی حرکت کسی ضابطہ کی پابند نہ ہوتی تو یہ حساب لگانا ممکن نہ ہوتا۔

لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ۔ (یٰسین - آیت ۴۰)	نہ سورج کے بس میں یہ ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات دن پر سبقت لے جا سکتی ہے۔

اس فقرے کے دو مطلب لیے جا سکتے ہیں اور دونوں صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ سورج میں یہ طاقت نہیں ہے کہ چاند کو پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لے، یا خود اس کے مدار میں داخل ہو کر اس سے جا ٹکرائے۔ دوسرا یہ کہ جو اوقات چاند کے طلوع و ظہور کے لیے مقرر کر دیے گئے ہیں ان میں سورج کبھی نہیں آ سکتا۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ رات کو چاند چمک رہا ہو اور یکایک سورج افق پر آ جائے۔

وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (یٰسین - آیت ۴۰)	سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔

فلک کا لفظ عربی زبان میں سیاروں کے مدار (ORBIT) کے لیے استعمال ہوتا ہے اور اس کا مفہوم سماء (آسمان) کے مفہوم سے مختلف ہے۔ یہ ارشاد کہ "سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں" چار حقیقتوں کی طرف نشان دہی کرتا ہے۔ ایک یہ کہ نہ صرف سورج اور چاند، بلکہ تمام تارے اور سیارے اور اجرامِ فلکی متحرک ہیں۔ دوسرے یہ کہ ان میں سے ہر ایک کا فلک، یعنی ہر ایک کی حرکت کا راستہ یا مدار الگ ہے۔ تیسرے یہ کہ افلاک تاروں کو لیے ہوئے گردش نہیں کر رہے ہیں بلکہ تارے افلاک میں گردش کر رہے ہیں اور چوتھے یہ کہ افلاک میں تاروں کی حرکت اس طرح ہو رہی ہے جیسے کسی سیال چیز میں کوئی شے تیر رہی ہو۔

نظامِ شمسی اور وسعتِ کائنات

ہماری یہ زمین جس نظامِ شمسی میں شامل ہے اس کی عظمت کا یہ حال ہے کہ اس کا مرکز، سورج زمین سے تین لاکھ گنا بڑا ہے، اس کے بعید ترین سیارے نیپچون کا فاصلہ سورج سے کم از کم ۲ ارب ۷۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل ہے۔ بلکہ اگر پلوٹو کو بعید ترین سیارہ مانا جائے تو وہ سورج سے ۴ ارب ۶۰ کروڑ میل دور تک پہنچ جاتا ہے۔ اس عظمت کے باوجود یہ نظامِ شمسی ایک بہت بڑے کہکشاں کا محض ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ جس کہکشاں (GALAXY) میں ہمارا یہ نظامِ شمسی شامل ہے اس میں تقریباً ۳ ہزار ملین (۳ ارب) آفتاب پائے جاتے ہیں اور اس کا قریب ترین آفتاب ہماری زمین سے اس قدر دور ہے کہ اس کی روشنی یہاں تک پہنچنے میں ۴ سال صرف

ہوتے ہیں۔ پھر یہ کہکشاں بھی پوری کائنات نہیں ہے، بلکہ اب تک کے مشاہدات کی بنا پر اندازہ کیا گیا ہے کہ یہ تقریباً ۲۰ لاکھ لولبی سحابیوں (SPIRAL NEBULAE) میں سے ایک ہے، اور ان میں سے قریب ترین سحابیے کا فاصلہ ہم سے اس قدر زیادہ ہے کہ اس کی روشنی دس لاکھ سال میں ہماری زمین تک پہنچتی ہے۔ سب سے بعید ترین اجرامِ فلکی جو ہمارے موجودہ آلات سے نظر آتے ہیں، ان کی روشنی تو زمین تک پہنچنے میں ۱۰ کروڑ سال لگ جاتے ہیں۔ اس پر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انسان نے ساری کائنات دیکھ لی ہے۔ یہ خدا کی خدائی کا بہت تھوڑا حصّہ ہے۔ جو اب تک انسانی مشاہدے میں آیا ہے۔ آگے نہیں کہا جا سکتا کہ مزید ذرائعِ مشاہدہ فراہم ہونے پر اور کتنی وسعتیں انسان پر منکشف ہوں گی۔

تمام معلومات جو اس وقت تک کائنات کے متعلق ہم پہنچی ہیں ان سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ پورا عالم اسی مادّے سے بنا ہوا ہے جس سے ہماری چھوٹی سی ارضی دنیا بنی ہے۔ اور اس کے اندر وہی ایک قانون کام کر رہا ہے جو ہماری زمین کی دنیا میں کار فرما ہے، ورنہ یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ ہم اس زمین پر بیٹھے ہوئے اتنی دور دراز دنیاؤں کے مشاہدے کرتے اور ان کے فاصلوں کو ناپتے اور ان کی حرکات کے حساب لگاتے۔

آسمان

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا (لقمٰن - آیت ۱۰) اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے جو تم کو نظر آئیں۔

اصل الفاظ ہیں بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ "تم خود دیکھ رہے ہو کہ وہ بغیر ستونوں کے قائم ہیں"۔ دوسرا مطلب یہ کہ "وہ ایسے ستونوں پر قائم ہیں جو تم کو نظر نہیں آتے"۔ ابنِ عباسؓ اور مجاہدؒ نے دوسرا مطلب لیا ہے، اور بہت سے دوسرے مفسرین پہلا مطلب لیتے ہیں۔ موجودہ زمانے کے علومِ طبیعی کے لحاظ سے اگر اس کا مفہوم بیان کیا جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ تمام عالمِ افلاک میں یہ بے حد و حساب عظیم الشان تارے اور سیارے اپنے اپنے مقام و مدار پر غیر مرئی سہاروں سے قائم کیے گئے ہیں۔ کوئی تار نہیں ہیں جنھوں نے ان کو ایک دوسرے سے باندھ رکھا ہو۔ کوئی سلاخیں نہیں ہیں جو ان کو ایک دوسرے پر گر جانے سے روک رہی ہوں۔ صرف قانونِ جذب و کشش ہے جو اس نظام کو تھامے ہوئے ہے۔ یہ تعبیر ہمارے آج کے علم کے لحاظ سے ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کل ہمارے علم میں کچھ اور اضافہ ہو اور اس سے زیادہ لگتی ہوئی کوئی دوسری تعبیر اس حقیقت کی کی جا سکے۔

آسمان اور زمین بنانے میں کتنے دن لگے

اَلَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا	وہ جس نے چھ دنوں میں زمین اور آسمانوں کو
بَیْنَهُمَا فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى	اور ان ساری چیزوں کو بنا کر رکھ دیا جو آسمان
الْعَرْشِ (الفرقان - آیت ۵۹)	وزمین کے درمیان ہیں۔
اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ	درحقیقت تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے
وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى	آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر اپنے
عَلَى الْعَرْشِ (الاعراف - آیت ۵۴)	تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا۔

زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کرنے کا مضمون متشابہات کے قبیل سے ہے جس کا مفہوم متعین کرنا مشکل ہے۔ ممکن ہے کہ ایک دن سے مراد ایک دور ہو اور ممکن ہے کہ اس سے مراد وقت کی اتنی مقدار ہو جس پر ہم دنیا میں لفظ دن کا اطلاق کرتے ہیں۔

یعنی دن کا لفظ یا تو اسی چوبیس گھنٹے کے دن کا ہم معنی ہے جسے دنیا کے لوگ دن کہتے ہیں، یا پھر یہ لفظ دور (PERIOD) کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسا کہ سورۂ حج آیت ۴۷ میں فرمایا وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (اور حقیقت یہ ہے کہ تیرے رب کے ہاں ایک دن ہزار سال کے برابر ہے اس حساب سے جو تم لوگ لگاتے ہو)، اور سورۂ معارج کی آیت ۴ میں فرمایا کہ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ اِلَیْهِ فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ (فرشتے اور جبریل اس کی طرف ایک دن میں چڑھتے ہیں جس کی مقدار ۵۰ ہزار سال کی ہے۔ اس کا صحیح مفہوم اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتا ہے۔

اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَةِ ن	ہم نے آسمان دنیا کو تاروں کی زینت سے
الْكَوَاكِبِ (الصفت - آیت ۶)	آراستہ کیا ہے۔

آسمانِ دنیا سے مراد قریب کا آسمان ہے جس کا مشاہدہ کسی دُوربین کی مدد کے بغیر ہم برہنہ آنکھوں سے کرتے ہیں۔ اس کے آگے جو عالم مختلف طاقتوں کی دوربینوں سے نظر آتے ہیں، اور جن عالموں تک ابھی ہمارے سائل مشاہدہ کی رسائی نہیں ہوئی ہے۔ وہ سب دور کے آسمان ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ "سماء" کسی متعین چیز کا نام نہیں ہے بلکہ قدیم ترین زمانے سے آج تک انسان بالعموم یہ لفظ اور اس کے ہم معنی الفاظ عالمِ بالا کے لیے استعمال کرتا چلا آ رہا ہے۔

عالم بالا محض خلا ہی نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے اس میں نفوذ کر جائے، بلکہ اس کی بندش ایسی مضبوط ہے اور اس کے مختلف خِطّے ایسی مستحکم سرحدوں سے محصور کیے گئے ہیں، کہ کسی شیطانِ سرکش کا ان حدود سے گزر جانا ممکن نہیں ہے۔ کائنات کے ہر تارے اور ہر سیارے کا اپنا ایک دائرہ اور کرہ (SPHERE) ہے جس کے اندر سے کسی کا نکلنا بھی سخت دشوار ہے اور جس میں سے باہر سے کسی کا داخل ہونا بھی آسان نہیں ہے۔[1] ظاہری آنکھ سے کوئی دیکھے تو خلائے محض کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ لیکن حقیقت میں اس خلا کے اندر بے حد و حساب خِطّے ایسی مضبوط سرحدوں سے محفوظ کیے گئے ہیں جن کے مقابلے میں آہنی دیواروں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اس کا کچھ اندازہ ان گوناگوں مشکلات سے کیا جا سکتا ہے جو زمین کے رہنے والے انسان کو اپنے قریب ترین ہمسائے چاند تک پہنچنے میں پیش آ رہی ہیں۔[2] ایسی ہی مشکلات زمین کی دوسری مخلوق، یعنی جنوں کے لیے بھی عالم بالا کی طرف صعود کرنے میں مانع ہیں۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ وَلَكُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا عَلَیْهَا حَاجَةً فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَیْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ۝

(المومن۔ آیات ۷۹۔۸۰)

اللہ ہی نے تمہارے لیے یہ مویشی جانور بنائے ہیں تاکہ ان میں سے کسی پر تم سوار ہو اور کسی کا گوشت کھاؤ۔ ان کے اندر تمہارے لیے اور بھی بہت سے منافع ہیں۔ وہ اس کام بھی آتے ہیں کہ تمہارے دلوں میں جہاں جانے کی حاجت ہو وہاں تم ان پر پہنچ سکو۔ ان پر بھی اور کشتیوں پر بھی تم سوار کیے جاتے ہو۔

زمین پر جو جانور انسان کی خدمت کر رہے ہیں، خصوصاً گائے، بیل، بھینس، بھیڑ، بکری، اونٹ اور گھوڑے، ان کو بنانے والے نے ایسے نقشے پر بنایا ہے کہ یہ با آسانی انسان کے پالتو خادم بن جاتے ہیں۔ اور ان

---

[1] ہر تارے اور سیارے کے خاص دائرے سے آگے ہر نظامِ شمسی اور ہر کہکشانی نظام کے مخصوص دائروں کا معاملہ زیرِ توجہ آتا ہے۔ غالباً یہاں پہنچ کر حفاظتی قلعہ بندیاں اور بھی سخت ہو جاتی ہوں گی۔

[2] چاند پر پہنچ جانے کے واقعات کی روشنی میں بعض ذہنوں کو اس طرح کی مختلف آیات کے سمجھنے میں مشکلات پیش آتی ہیں۔ چاند تو مستقل بالذات سیارہ نہیں ہے، بلکہ وہ سیارۂ ارض کا ذیلی سیارہ ہے۔

سے اُس کی بے شمار ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ ان پر سواری کرتا ہے، ان سے باربرداری کا کام لیتا ہے، انھیں کھیتی باڑی کے کام میں استعمال کرتا ہے۔ ان کا دودھ نکال کر اسے پیتا بھی ہے اور اس سے دہی، لسی، مکھن، گھی، کھویا، پنیر اور طرح طرح کی مٹھائیاں بناتا ہے۔ ان کا گوشت کھاتا ہے۔ ان کی چربی استعمال کرتا ہے۔ ان کے اُون اور بال اور کھال اور آنتیں اور ہڈی اور خون اور گوبر، ہر چیز اس کے کام آتی ہے۔ کیا یہ اس بات کا کھلا ہوا ثبوت نہیں ہے کہ انسان کے خالق نے زمین پر اس کو پیدا کرنے سے بھی پہلے اس کی ان بے شمار ضروریات کو سامنے رکھ کر یہ جانور یہ اس خاص نقشے پر پیدا کر دیے تھے تاکہ وہ ان سے فائدہ اٹھائے۔

اصل کارفرمائی اللہ تعالیٰ کی ہے

اَلَمْ تَرَ اَنَّ الْفُلْكَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِنِعْمَتِ اللّٰهِ لِیُرِیَكُمْ مِّنْ اٰیٰتِهٖ۔ (لقمٰن۔ آیت ۳۱)	"کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ کشتی سمندر میں اللہ کے فضل سے چلتی ہے تاکہ وہ تمھیں اپنی کچھ نشانیاں دکھائے؟"

یعنی ایسی نشانیاں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اختیارات بالکل اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں۔ انسان خواہ کیسے ہی مضبوط اور بحری سفر کے لیے موزوں جہاز بنالے اور جہاز رانی کے فن اور اس سے تعلق رکھنے والی معلومات اور تجربات میں کتنا ہی کمال حاصل کرلے، لیکن سمندر میں جن ہولناک طاقتوں سے اس کو سابقہ پیش آتا ہے اس کے مقابلے میں وہ تنہا اپنی تدابیر کے بل بوتے پر بخیریت سفر نہیں کرسکتا جب تک اللہ کا فضل شامل حال نہ ہو۔[1]

---

[1] پھر زمین کا تین چوتھائی حصہ پانی سے لبریز ہے اور صرف ایک چوتھائی خشکی پر مشتمل ہے۔ خشک حصوں کے بھی بہت سے چھوٹے اور بڑے رقبے ایسے ہیں جن کے درمیان پانی حائل ہے۔ کرۂ زمین کے ان خشک علاقوں پر انسانی آبادیوں کا پھیلنا اور پھران کے درمیان سفر و تجارت کے تعلقات کا قائم ہونا اس کے بغیر ممکن نہ تھا کہ پانی اور سمندروں اور ہواؤں کو ایسے قوانین کا پابند بنایا جاتا جن کی بدولت جہاز رانی کی جاسکتی، اور زمین پر وہ سروسامان پیدا کیا جاتا جسے استعمال کرکے انسان جہاز سازی پر قادر ہوتا۔ کیا یہ اس بات کی صریح علامت نہیں ہے کہ ایک ہی قادرِ مطلق ربِّ رحیم و حکیم ہے جس نے انسان اور زمین اور پانی اور سمندروں اور ہواؤں اور ان تمام چیزوں کو جو زمین پر ہیں اپنے خاص منصوبے کے مطابق بنایا ہے۔ بلکہ اگر انسان صرف جہاز رانی کے نقطۂ نظر سے دیکھے تو اس میں تاروں کے مواقع اور سیاروں کی باقاعدہ گردش سے جو مدد ملتی ہے وہ اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ زمین ہی نہیں، آسمانوں کا خالق بھی وہی ایک ربِّ کریم ہے۔

اس کی نگاہِ کرم پھرتے ہی آدمی کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے ذرائع و وسائل اور کمالاتِ فن کتنے پانی میں ہیں۔
اسی طرح آدمی امن و اطمینان کی حالت میں چاہے کیسا ہی سخت دہریہ یا کٹا مشرک ہو، لیکن سمندر کے طوفان میں جب اس کی کشتی ڈوبنے لگتی ہے اس وقت دہریے کو بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا ایک ہے اور مشرک بھی جان لیتا ہے کہ خدا بس ایک ہی ہے۔

اَللّٰهُ الَّذِيْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ	وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمھارے لیے سمندر کو
لِتَجْرِيَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَ	مسخر کیا تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں اس میں چلیں
لِتَبْتَغُوْا مِنْ فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ	اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور شکر گزار ہو۔
تَشْكُرُوْنَ ۝ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي	اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری ہی چیزوں کو
السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا	تمھارے لیے مسخر کر دیا، سب کچھ اپنے
مِّنْهُ (الجاثیہ۔ آیات ۱۲-۱۳)	پاس سے۔

اس فقرے کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کا یہ عطیہ دنیا کے بادشاہوں کا سا عطیہ نہیں ہے جو رعیت سے حاصل کیا ہوا مال رعیت ہی میں سے کچھ لوگوں کو بخش دیتے ہیں، بلکہ کائنات کی یہ ساری نعمتیں اللہ کی اپنی پیدا کردہ ہیں اور اس نے اپنی طرف سے یہ انسان کو عطا فرمائی ہیں۔ دوسرے یہ کہ نہ ان نعمتوں کے پیدا کرنے میں کوئی اللہ کا شریک ہے نہ انھیں انسان کے لیے مسخر کرنے میں کسی اور ہستی کا کوئی دخل۔ تنہا اللہ ہی ان کا خالق بھی ہے اور اس نے اپنی طرف سے وہ انسان کو عطا کی ہیں۔

ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ (عبس۔ آیت ۲۰) پھر اس کے لیے زندگی کی راہ آسان کر دی۔

یعنی دنیا میں وہ تمام اسباب و وسائل فراہم کیے جن سے یہ کام لے سکے، ورنہ اس کے جسم اور اس کے ذہن کی ساری قوتیں بے کار ثابت ہوتیں اگر خالق نے ان کو استعمال کرنے کے لیے زمین پر یہ سروسامان مہیا نہ کر دیا ہوتا اور یہ امکانات پیدا نہ کر دیے ہوتے۔

حضرت امام شافعیؒ

(۱۵۰ھ تا ۲۰۴ھ)

جناب عبد الرشید عراقی صاحب

نام و نسب | محمد نام، کنیت ابو عبد اللہ، ناصر السنۃ لقب، شافعیؒ اُن کے جدِ اعلیٰ شافع کی طرف نسبت ہے۔ ساتویں پشت پر آپ کا سلسلۂ نسب آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے مل جاتا ہے۔

وِلادت | آپ کی ولادت بمقام غزہ رجب ۱۵۰ھ کو ہوئی۔ جس دن آپ پیدا ہوئے۔ اسی دن امام ابو حنیفہؒ کا انتقال ہوا۔

اس پر ایک لطیفہ ہے۔ احناف نے شوافع سے مزاحاً کہا، کہ جب تک ہمارے امام زندہ رہے، آپ کے امام نے منصۂ شہود پر آنے کی جرأت نہ کی۔ شوافع نے جواب دیا: بلکہ یوں کہیے کہ تحمل و تاب کا فقدان ہے۔ اُدھر امام پیدا ہوئے اور آپ کے امام نے رختِ سفر باندھا۔

تحصیلِ علم | سات سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا۔ دس سال کی عمر میں موطا امام مالک کو یاد کر لیا ۱۵ سال کی عمر میں اپنے شیخ مسلم بن خالد زنجی کی اجازت سے فتویٰ دینے لگے[1]۔ ۱۳ سال کی عمر میں امام مالک بن انسؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ امام مالکؒ نے فرمایا:

"تمہارے قلب میں ایک نور ہے، معاصی سے اسے ضائع نہ کرنا، تقویٰ کو اپنا

---

[1] طبقات الشافعیہ الکبریٰ ج ۱ ص ۱۰۰

شعار بنانا، ایک دن آئے گا کہ تم بڑے شخص ہو گے"۔[1]

جب آپ نے امام مالکؒ کے سامنے مؤطا کی قرأت زبانی کی تو انہیں بہت تعجب ہوا۔ آپ امام صاحب کی خدمت میں صرف ۸ ماہ رہے۔ اس کے بعد مکہ معظمہ تشریف لے گئے، اور محدثِ شہیر حضرت سفیان بن عُیَینہ سے استفادہ کرتے رہے۔

امام شافعیؒ پر دورِ ابتلاء تحصیلِ علم کے بعد فکرِ معاش دامن گیر ہوئی۔ اتفاقاً والیٔ یمن مدینہ آیا بعض عمائد نے والیٔ یمن سے حضرت امام کی سفارش کی کہ محمد ادریس شافعی اس قابل ہیں کہ انہیں کوئی سرکاری ملازمت دی جائے۔ چنانچہ آپ نجران کے گورنر مقرر کر دیے گئے۔ مگر والیٔ یمن بہت سفاک اور ظالم تھا۔ امام صاحب کے نوٹس میں یہ بات آئی تو آپ نے "افضل الجہاد کلمۃ الحق عند سلطان جائر" کے تحت والیٔ یمن کو ظلم و زیادتی سے روکا۔ اس پر بجائے اس کے کہ والیٔ یمن اپنی اصلاح کرتا، اُس نے خلیفۂ وقت ہارون الرشید کو امام صاحب کے خلاف کر دیا۔ ہارون الرشید نے امام صاحب کو دارالحکومت میں طلب کیا۔ چنانچہ جب آپ ہارون الرشید کے دربار میں پیش ہوئے، تو وہاں قاضی امام محمد بھی موجود تھے۔ چنانچہ امام محمدؒ نے سفارش کر کے معاملہ رفع دفع کرا دیا۔

یہ واقعہ ۱۸۴ھ میں پیش آیا۔ اُس وقت امام صاحب کی عمر ۳۴ سال تھی۔[2]

امام محمد کی خدمت میں جب آپ کو ہارون الرشید کی تلوار سے نجات ملی تو آپ امام محمدؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے۔ شامل ہونے سے پہلے آپ امام محمدؒ کے مرتبۂ اجتہاد و تفقہ سے پوری طرح واقف ہو چکے تھے۔ امام محمد فقہِ عراق کے حامل و ناشر تھے۔ یہیں سے امام شافعیؒ کی زندگی نے پلٹا کھایا، اور از سرِ نو تحصیلِ علم میں مشغول ہوئے۔[3]

امام شافعیؒ، امام محمدؒ کی خدمت میں ۳ سال تک رہے، اور اس عرصہ میں بکمال فقہِ عراق پر عبور حاصل کیا، اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ آپ ایک علیحدہ فقہ کے بانی و مؤسس قرار پائے۔[4]

---

[1] وفیات الاعیان — [2] توالی التاسیس ص ۶۹

[3] حیاتِ شافعی ابو زہرہ ص ۲۴۶ — [4] ایضاً

امام محمدؒ امام شافعیؒ کا بہت خیال رکھتے تھے۔ خود امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے جو امام صاحب سے پڑھا اُسنا دہ بار شتر کے برابر ہے۔[1]

سفر برائے علم بغداد سے امام شافعیؒ مکہ معظمہ واپس آئے اور حرم میں بیٹھ کر درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔ اسی زمانے میں بڑے بڑے علمائے کرام سے آپ کی ملاقات ہوئی۔ امام احمد بن حنبل سے بھی آپ کی ملاقات اسی زمانے میں ہوئی۔

اس وقت امام شافعیؒ کی شخصیت نئی فقہ کے ساتھ ظاہر ہو چکی تھی۔ یہ فقہ نہ تو اہل مدینہ کی فقہ تھی۔ اور نہ اہل عراق کی۔ بلکہ ان دونوں سے مخلوط ایک نئی چیز تھی۔ یہ فقہ نہایت ذہین و عقیل شخص کی اُس عقل کی آئینہ دار تھی جو کتاب و سنّت اور لوگوں کے حالات و قیاس اور رائے سے پختہ ہو چکی تھی۔

اس مرتبہ امام شافعیؒ کا قیام مکہ معظمہ میں تقریباً ۹ سال رہا۔ اور اس دوران آپ نے اجتہاد و استنباط کے جو اصول وضع کئے تھے، اور جو ضوابط تیار کئے تھے، ضروری تھا کہ وہ جمہور فقہاء کے سامنے پیش کریں۔ عراق اس وقت اہل الرائے اور اہل الحدیث کا مرکز تھا۔ اس لیے آپ نے دوبارہ بغداد کا سفر اختیار کیا۔ اور یہ زمانہ ۱۹۵ھ کا تھا۔ اس دوران آپ نے قیامِ بغداد میں بہت سے حضرات سے علمی استفادہ کیا۔ اسی زمانے میں آپ نے اپنی مشہور کتاب الرسالہ تصنیف کی۔ آپ کا یہ قیام بغداد میں تقریباً ۲ سال رہا۔ پھر ۱۹۸ھ میں تیسری بار بغداد گئے۔ اور صرف ایک ماہ قیام کے بعد مصر تشریف لے گئے۔ یہ ۱۹۹ھ کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد تادمِ وفات (۲۰۴ھ) مصر ہی میں قیام رہا۔[2]

تلامذہ تلامذہ کی فہرست بہت طویل ہے۔ اِن میں ایک جماعت وہ ہے، جو بغداد یا مکہ معظمہ میں ان سے استفادہ کرتی رہی۔ جیسے ابوالولید موسیٰ بن جارُود، ابو علی الزعفرانی، امام احمد بن حنبلؒ امام اسحاق بن راہویہ۔

---

[1] تاریخ ابن خلکان جلد ۳ ص ۳۰۶

[2] محدثین عظام اور اُن کے علمی کارنامے ص ۹۹

اور ایک جماعت وہ ہے جو مصر میں اُن سے استفادہ کرتی رہی۔ جیسے امام مزنیؒ، ربیع المرادی، بویطی، حرملہ اور یونس بن عبدالاعلیٰ۔

یہ حضرات امام شافعیؒ کے مذہب جدید کے راوی ہیں۔ ان لوگوں نے امام شافعیؒ کے بعد اُن کے علوم کو مرتب و مدون کیا۔[1]

تصانیف ملا علی قاری نے امام شافعیؒ کی تصانیف کی تعداد ۱۱۳ بتائی ہے۔[2] ان میں سے کتاب الرسالہ، کتاب الام اور سنن شافعیؒ زیادہ مشہور ہیں۔ اور یہاں صرف کتاب الرسالۃ" کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

کتاب الرسالہ اس کا پورا نام کتاب الرسالۃ فی اصول الفقہ والحدیث ہے۔ یہ کتاب امام شافعیؒ نے عبدالرحمٰن بن مہدی کی استدعا پر تصنیف کی۔

امام صاحب کی یہ کتاب اصول حدیث اور فقہ میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔ امام فخرالدین رازی اپنی کتاب مناقب الامام الشافعیؒ میں لکھتے ہیں کہ:-

" امام شافعیؒ کی حیثیت اصول فقہ میں ایسی ہے جیسی منطق میں ارسطو کی۔ اور عروض میں خلیل بن احمد کی۔ امام شافعیؒ اس اعتبار سے ائمہ ثلاثہ سے ممتاز نظر آتے ہیں کہ امام شافعیؒ نے اس کتاب کے ذریعے ایک مخصوص طرزِ فکر کی بنیاد رکھی، جس نے آنے والے زمانہ میں فقہِ اسلام کے ارتقاء میں بنیادی کردار ادا کیا۔[3]

اس کتاب میں امام شافعیؒ نے قرآن و سنّت کو اسلامی قانون کا ماخذ قرار دیا ہے۔ امام صاحب لکھتے ہیں کہ:-

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ایک شارح کی ہے اور آپؐ کے فیصلے ایک الہامی حیثیت رکھتے ہیں۔ نیز احادیثِ رسولؐ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے تکملہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔[4]

امام شافعیؒ کے بعد جن علمائے کرام، فقہائے عظام نے اصولِ فقہ و حدیث پر جو کتابیں تصنیف

---

[1] الشافعی ابو زہرہ
[2] ایضاً
[3] کتاب الرسالہ اردو ص ۲
[4] ایضاً

کی ہیں وہ سب کی سب اسی کتاب کی رہینِ منّت ہیں۔

مناقب امام احمد فرماتے ہیں کہ میں نے ناسخ سے منسوخ کا امتیاز اس وقت تک نہیں معلوم کیا، اور خاص کو عام سے اس وقت تک علیحدہ نہیں کیا جاتا، اور تفصیل اور اجمال میں جو فرق ہے، اُس کو نہیں پہچانا، جب تک امام شافعیؒ کی صحبتوں میں شریک نہیں ہوا۔ اسی لیے آپ امام شافعیؒ کو دوسری صدی کا مجدّد مانتے ہیں (حسن المحاضرہ ص ۱۲۶)

اور حضرت امام احمدؒ نے آپ سے جتنا استفادہ کیا ہے، شاید ہی کسی اور نے کیا ہو۔ آپ ہمیشہ اپنی دعاؤں میں اپنے والدین کے ساتھ حضرت امام شافعیؒ کا نام لیتے۔ اور اُن کی بخشش کے لیے اللہ کی جناب میں ہاتھ پھیلاتے۔

سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں کہ میں جب بھی کسی تفسیر و فتویٰ میں اُلجھتا تو سیدھا امام شافعیؒ کے پاس پہنچتا۔

زہد و تقویٰ کا یہ حال تھا کہ مطالعہ کتب کے بعد التزام کے ساتھ شب بیداری فرماتے۔ اُن کا کہنا تھا کہ علماء جب تک اس دُنیا میں اللہ کے دوست نہیں ہوں گے، عقبیٰ میں خدا کی ولایت کو نہیں پاسکیں گے۔

فقر کے متعلق اُن کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ علماء کو فقر خاص طور پر زینت بخشتا ہے، جب کہ اس کے ساتھ قناعت اور اللہ کی خوشنودی کا خیال مقدم رہتا ہو۔ علماء اور جہلا کے فقر میں یہ فرق ہے کہ جہلاء کا فقر اضطراری ہوتا ہے اور علماء کا اختیاری۔

امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد رشید جتنا احترام آپ کا کرتے اور کسی کا نہ کرتے۔ ایک مرتبہ امام محمدؒ کہیں گھوڑے پر سوار ہو کر جا رہے تھے کہ راستے میں اُن کی مڈبھیڑ حضرت امام شافعیؒ سے ہوگئی گھوڑے سے نیچے اُترے اور آپ کو اپنے ساتھ اپنے گھر لے گئے۔ پورا دن اُن کے ساتھ علمی مذاکرات میں گزارا۔ امام شافعیؒ کے حافظے کے متعلق اُن کی شہادت یہ ہے کہ انہوں نے کتاب اوسط ابوحنیفہؒ مجھ سے عاریۃً لی اور رات رات میں یاد کر ڈالی۔

اور آپ کو یہ سند عطا کی!

"ان تکلم اھل الحدیث یوماً فبلسان الشافعیؒ"

ترجمہ :- اگر کسی روز اصحاب حدیث کلام کریں گے تو امام شافعیؒ کی زبان میں۔

امام محمدؒ یہ بھی فرماتے ہیں کہ :-

"کوئی ایسا محدث نہیں، جس نے قلم دوات کو ہاتھ لگایا ہو، مگر شافعیؒ کا اُس کی گردن پر احسان نہ ہو۔ ہمیں مجمل و مفصل، اور ناسخ و منسوخ حدیث کا علم نہیں ہوا، یہاں تک کہ ہم امام شافعیؒ کی مجلس میں بیٹھے۔ (تاریخ ابن خلکان جلد ۳ ص ۳۵۔

کسی نے فارسی میں خوب کہا کہ :-

"ہر کہ در دستش قلم دوات است، شافعیؒ را بہ گردنِ اُو منّت است"۔

البتہ امام شافعیؒ نے کوئی درسِ حدیث کی باقاعدہ مجلس نہیں قائم کی، کیونکہ وہ امام و مجتہد تھے۔ وہ حدیث پر اصولی حیثیت سے گفتگو کرتے تھے۔ اور حدیث کو استنباط و استخراجِ مسائل کے لیے تلاش کرتے تھے۔ مگر تاریخِ حدیث میں اُن کے کارنامے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ذوقِ ادب امام شافعیؒ ادب میں حرف آخر تھے، جو حضرات عربی زبان پر عبور کامل رکھتے ہیں وہی جان سکتے ہیں کہ امام صاحب کو عربی زبان پر کتنی قدرت حاصل تھی۔ یہ کہنا بالکل درست ہے کہ امام صاحب نظم و نثر کے بادشاہ تھے۔ یہاں آپ کے کلام کا اُردو ترجمہ پیش کیا جاتا ہے، اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ آپ کا ادب میں کیا مقام ہے۔ فرماتے ہیں :-

"زمانے نے جتنی تادیب و ترتیب کی، اُس سے یہی معلوم ہوا کہ عقل و بصیرت کی پونجی ہم میں کس قدر کم ہے۔ جس جس نسبت و انداز سے علم میں اضافہ ہوا اُسی نسبت سے یہ احساس بڑھا کہ جہالت کی کتنی بڑی مقدار ہم میں ہنوز موجود ہے"۔

علم و فضل کی درماندگی اور بخت و نصیب کی یاوری پر اُن کی رائے ملاحظہ ہو :-

"جسے دولت سے تو حصّہ ملا لیکن نہ حمد میسّر ہو، نہ صلہ، تو وہ خوش نصیب نہیں ہے۔ جدوجہد دُور دُور کی سرحدات کو قریب تر کر دیتی ہے اور یقیناً کامیابی کی ہر باب کی کلید ہے"۔

جب تم یہ سنو، کہ ایک خوش بخت نے سوکھی لکڑی اٹھائی اور وہ اُس کے ہاتھ میں بار آور ہو گئی تو مان لو۔ اسی طرح ایک اور محروم نصیب کے متعلق جب یہ سنو کہ پانی کے چشمے تک پہنچا اور وہ سوکھ گیا تو اس کی تصدیق کرو۔ اگر رزق وسائل و ذرائع پر موقوف ہوتا

تو مجھے تم دیکھنے کہ ستاروں سے راہ و ربط ہے۔ بات یہ ہے کہ جسے عقل کی دولت ملی ہے، وہ روپے سے محروم ہے۔ قضا وقدر کے تصرفات پر یہ کھلی ہوئی دلیل ہے۔ کہ علم وعقل والے تو بھوکوں مریں اور احمق مزے اڑائیں"۔

چند اشعار کا اُردو ترجمہ ملاحظہ فرمائیں اور حضرت امام کے شعری ادب کی داد دیں۔

"حاسد میری پیٹھ پیچھے تو میری بُرائیاں کرتے ہیں مگر جب میرے سامنے آتے ہیں تو میری بڑی تعریف کرتے ہیں۔ جب تمہیں اپنی عزت کا خیال نہیں، نہ خدا کا خوف ہے، نہ مخلوق کی شرم ہے تو پھر جو چاہے کرو"۔

"اے دُنیا اور دُنیا کی زینت پر دھوکا کھانے والو! یاد رکھنا کہ زمانہ مکان اور مکان بنانے والے دونوں کو برباد کر دے گا۔ جس کو دُنیا کی عزت و وجاہت پسند ہو، اُس کو معلوم ہونا چاہیے کہ یہ عزت جلد مٹ جانے والی ہے۔ یاد رکھو کہ دُنیا کے خزانے تو سونے سے بھرے جاتے ہیں۔ مگر تم اپنا خزانہ ایمان اور نیکی سے بھرو"۔

"جب تم سفر میں کسی کے ہمراہ جاؤ تو اپنے ساتھیوں کے ساتھ حقیقی بھائیوں کی طرح برتاؤ کرو عقل مند اور عالم اپنے عیوب پر نظر رکھتا ہے اور اپنے ساتھی کے عیب سے چشم پوشی کرتا ہے"۔

"میں نے طمع کو چھوڑ کر خود کو آرام پہنچایا۔ نفس میں جس قدر لالچ بڑھتا جاتا ہے وہ ذلیل ہوتا جاتا ہے۔ قناعت جو مُردہ تھی اُس کو میں نے جگایا۔ قناعت کی زندگی ہی میری عزت کی حفاظت ہے۔ جیسا انسان کے دل میں لالچ کا جذبہ مستقل گھر کر لیتا ہے تو پھر وہ انسان روز بروز ذلیل ہی ہوتا جاتا ہے"۔[1]

وفات | امام شافعیؒ کو بواسیر کی شکایت تھی۔ جیسا کہ امام ابن حجر عسقلانیؒ نے تحریر کیا ہے کہ شدید حملے ہونے تو بہت خون بہہ جاتا۔

بالآخر عالم اسلام کی اس ہستی نے ـــــ ۳۰ رجب ۲۰۴ھ ۵۴ سال کی عمر میں اس دار فانی سے دار البقا کی طرف کوچ کیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

[1] ملخص از سیرت ائمہ از رئیس احمد جعفری ندوی۔

محدثِ قرطبہ بقی بن مخلد رحمۃ اللہ علیہ

جناب طیب شاہین صاحب

(۵)

فتاوٰی صحابہ و تابعین تفسیر اور مسند کے علاوہ امام بقی بن مخلدؒ نے صحابہؓ، تابعین تبع تابعین اور دیگر اہل علم کے فتاوٰی بھی جمع کیے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض ظاہر بین محدث نہ تھے جس کی تمام تر کاوش اسنادِ حدیث کی چھان پھٹک تک ہی محدود ہو بلکہ وہ گہری فقیہانہ نظر بھی رکھتے تھے۔ متقدمین اور اپنے ہم عصر علماء کی آراء پر بھی کامل دسترس رکھتے تھے۔ نصوص کی تعبیر اور فقہی استنباط میں حق و صواب تک پہنچنے کے لیے علمائے حق کی آراء سے مدد لیتے تھے۔ فقہائے اہل سنت کا عمومی طریق کار بھی یہی ہے۔

علامہ ابن حزم رقمطراز ہیں:۔

"امام بقی بن مخلد کی ایک اور تصنیف بھی ہے جس میں صحابہ و تابعین کے فتاوٰی جمع کیے گئے جس میں وہ مصنف ابی بکر ابن شیبہؒ مصنف عبدالرزاقؒ اور مصنف سعید بن منصورؒ پر بھی فوقیت لے گئے ہیں۔"

اندلس پر بقیؒ کے اثرات امام بقی بن مخلدؒ کی جد و جہد سے اندلس میں مطالعہ حدیث کا وسیع میدان کھل گیا۔ اور اندلس میں بھی علمی نشوونما شروع ہوئی۔ جناب بقیؒ کے زمانے ہی میں اور ان کے بعد بہت سے علماء نے طریقہ سلف پر قرآن و سنت سے آزادانہ استنباط کیا۔ جس نے اندلس میں فقہ اسلامی کے ارتقاء میں بہت اہم کردار ادا کیا۔ اندلس مشرق کے شانہ بشانہ چلتا رہا۔ اندلسی علماء

نے علومِ اسلامی کی نشوونما میں پورا پورا حصہ لے کر مشرق کی قدم بقدم پیروی کی اور یوں علمی میدان میں ان کا مشرق کی برابری کا دعویٰ بہت حد تک صحیح ہے۔

بقی بن محمدؒ، ابو عبداللہ محمد بن وضاحؒ (المتوفی ۲۸۹ھ)، ابوالحسن محمد بن عبدالسلام الخشنیؒ (المتوفی ۲۸۶ھ)، ابو محمد قاسم بن محمد بن قاسم (المتوفی ۲۷۶ھ) اندلس میں حریتِ فکر کے اساطین ایسے ہیں جنہوں نے مروجہ فقہی روش سے ہٹ کر اندلس کو ایک نئی راہ سے روشناس کرایا۔ ان کے بعد ابوعلی حسن بن سعدؒ۔ ابومحمد قاسم بن اصبغ، ابوالحکم منذر بن سعید ابوالخیار مسعود بن سلیمان بن عفلت کے اسمائے گرامی نظر آتے ہیں جنہوں نے حدیث نبوی کی اشاعت اور فقہ اثری کی ترویج میں بھرپور حصہ لیا۔ تیسری صدی کے اوائل میں جہاں اندلس میں صرف مؤطا امام مالکؒ کی تدریس ہوتی تھی، پچاس برس کے اندر حدیث کے دوسرے مجموعے بھی اندلس پہنچ گئے۔ اب اندلس کے مراکزِ علم میں امام احمدؒ، امام ابی بکر ابن ابی شیبہؒ، امام عبدالرزاق، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ابوداؤد، امام محمد بن جریر طبریؒ، امام ابوعُبید قاسم بن سلامؒ اور دیگر علمائے حدیث کی مرویات کا بھی چرچا ہونے لگا۔ اختلافِ مذاہب کے مطالعہ کی صورت میں امام مالکؒ اور ان کے اصحاب کی آراء کے ساتھ ساتھ امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب امام ابی لیلیٰؒ، امام اوزاعی، امام لیث بن سعدؒ، امام شافعیؒ، یحییٰ بن بکیرؒ اور دیگر نامور اصحاب کی آراء کا بھی مطالعہ ہونے لگا۔ یہ صرف امام بقیؒ ہی تھے جنہوں نے اندلس میں اختلاف مذاہب بیان کرنے کا آغاز کیا اور امام مالکؒ اور دیگر فقہائے اسلام کی آراء کا موازنہ کیا۔ یہ آزادی فکر بعض اندلسی علماء پر ناگوار گزری اور قرطبہ کے اس محدث کو اس آزادی کی سزا بھگتنا پڑی۔ لیکن یہ ایک روشنی تھی جو ہر سو پھیل گئی اور چند برسوں کے اندر اندر اندلس کے گوشے گوشے کو منور کر گئی۔

اس کے بعد جب ہم پانچویں صدی ہجری میں قدم رکھتے ہیں تو ہمیں بہت سے ایسے جلیل القدر علماء دکھائی دیتے ہیں جنہوں نے سنتِ نبوی کا وسیع مطالعہ کرنے کے بعد سلف کی آراء کو آزادانہ محاکمے کے بعد اختیار کیا۔ ان میں بعض ایسے علماء بھی ہیں جنہوں نے فکرِ اسلامی پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ جن کی گرمیٔ افکار کو مشرق کے دبستانوں میں بھی محسوس کیا گیا ان میں علامہ ابومحمد ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ سرفہرست ہیں۔

امام بقی بن مخلد

امام بقی بن مخلد کو اللہ تعالیٰ نے صالح اولاد سے نوازا - ان میں سے اکثر اہل فتویٰ علما تھے - ان کی اولاد میں بہت سے اہل علم اندلس میں قرطبہ اور دیگر شہروں میں قضا کے عہدوں پر مامور رہے - سقوط قرطبہ (۶۳۳ھ / ۱۲۳۶ء) مطابق سنہ تک ان کی اولاد مختلف علمی مناصب پر فائز رہی - اور علمی حلقوں میں مرجع خلائق بنی رہی - نیچے آل بقی بن مخلد کا ایک شجرۂ نسب دیا جا رہا ہے جو ہم نے " نفح الطیب " کے حاشیے سے " احمد یوسف نجاتی " کے مختصر نوٹ کی مدد سے ترتیب دیا ہے -

ابو عبد الرحمن : بقی بن مخلد (المتوفیٰ ۲۷۶ھ)

|

ابو عبد اللہ احمد بن بقی (المتوفیٰ ۳۲۴ھ) ، قاضی قرطبہ

|

ابو الحسن عبد الرحمن بن احمد (المتوفیٰ ۳۶۶ھ)

|

ابو عبد اللہ مخلد بن عبد الرحمن (المتوفیٰ ۴۰۸ھ)

- ابو الحسن عبد الرحمن بن مخلد (قاضی طلیطلہ المتوفیٰ ۴۳۷ھ)
- ابو عبد اللہ احمد بن مخلد (المتوفیٰ ۴۳۰ھ)
  - ابو عبد اللہ محمد بن احمد (قاضی قرطبہ ۴۷۰ھ)
    - ابو الحسن عبد الرحمن بن محمد (قاضی قرطبہ المتوفیٰ ۵۱۵ھ)
    - ابو القاسم احمد بن محمد المفتی قرطبہ المتوفیٰ ۵۳۲ھ)
      - ابو الحسن عبد الرحمن بن احمد قاضی قرطبہ المتوفیٰ ۵۴۳ھ)
        - ابو الولید یزید بن عبد الرحمن (قاضی بسکرۃ - افریقہ المتوفیٰ ۵۸۰ھ)
          - ابو الحسن مخلد بن یزید (المتوفیٰ ۶۲۲ھ)
          - ابو القاسم احمد بن یزید (قاضی قرطبہ و قاضی مراکش - المتوفیٰ ۶۲۵ھ)

بقی بن مخلد کے تلامذہ | اندلس کے بے شمار علماء نے امام بقی بن مخلد سے اکتساب علم کیا جن میں اکثر حضرات اصحاب تصانیف اور اہل فتویٰ تھے۔ ان کے تلامذہ میں احمد بن بقی بن مخلد، احمد بن عبداللہ الاموی، اسلم بن عبدالعزیز، محمد بن عمر بن لبابہ، حسن بن سعد القرطبی، عبداللہ بن یونس القبری، طاہر بن عبدالعزیز بن عبداللہ القرطبی، ابو عمر احمد بن خالد المعروف بہ ابن الجباب اور علامہ ابو محمد قاسم ابن اصبغ القرطبی زیادہ مشہور ہیں۔

بعض مؤرخین مشہور شاعر ابن عبدربہ صاحب "العقد الفرید" کو بھی امام بقی کا شاگرد بتاتے ہیں۔

ماٰخذ | ۱۔ دائرہ معارف اسلامی اُردو۔ جامعہ پنجاب۔
۲۔ عبرت نامہ اندلس۔ پروفیسر رائن ہارٹ ڈوزی۔ اُردو ترجمہ مولوی عنایت اللہ۔ مقبول اکیڈمی۔ لاہور۔
۳۔ وفیات الاعیان۔ ابن خلکانؒ طبع مصر۔
۴۔ زرقانی شرح مؤطا امام مالکؒ۔ زرقانیؒ۔ طبع مصر۔
۵۔ معجم الادباء۔ یاقوت حمویؒ۔ بتحقیق مارگولیتھ۔ طبع ثانی۔ مطبع ہندیہ مصر۔
۶۔ تذکرۃ الحفاظ۔ علامہ ذہبیؒ۔
۷۔ اعلام الموقعین۔ علامہ ابن قیمؒ مصر۔
۸۔ طبقات الحنابلۃ۔ ابن ابی یعلیٰ۔ مطبعۃ السنۃ المحمدیہ۔ مصر۔
۹۔ تفسیر سورۃ الاخلاص۔ امام ابن تیمیہؒ۔ مطبع حسینیہ مصر۔
۱۰۔ نفح الطیب۔ علامہ مقریؒ۔ طبع عیسیٰ البابی الحلبی مصر
۱۱۔ معجم المؤلفین۔ علامہ یاقوت۔
۱۲۔ النجوم الزاہرۃ فی ملوک مصر والقاہرۃ۔ الاتابکی طبع مصر
۱۳۔ تاریخ الادب العربی۔ کارل بروکلمان۔ طبع دارالمعارف مصر (تعریب)
۱۴۔ ابن حزم۔ پروفیسر ابوزہرہ۔ اُردو ترجمہ۔
۱۵۔ تاریخ بغداد۔ علامہ خطیب بغدادی۔ طبع بیروت۔

۱۶۔ تنویر الحوالک ۔ شرح موطا امام مالک ۔ علامہ سیوطیؒ ۔ طبع مصر
۱۷۔ مقدمۃ ابن خلدون اردو ترجمہ ۔ طبع اصح المطابع کراچی
۱۸۔ تاریخ افکار و علوم اسلامی ۔ راغب طباخ ۔ اردو ترجمہ ۔ ادارہ معارف اسلامی کراچی
۱۹۔ الاتقان فی علوم القرآن ۔ علامہ سیوطیؒ ۔ طبع مصطفی البابی مصر ۱۹۵۱ء ۔
۲۰۔ تدریب الراوی ۔ علامہ سیوطیؒ طبع مکتبہ علمیہ مدینہ منورہ ۱۹۵۹ء ۔
۲۱۔ البدایۃ والنہایۃ علامہ ابن کثیرؒ طبع مطبعۃ السعادۃ ۔ مصر ۔
۲۲۔ الباعث الحثیث علامہ احمد محمد شاکرؒ طبع مطبعۃ محمد علی صبیح ۔ مصر ۔
۲۳۔ مسند الامام احمد بتحقیق احمد محمد شاکرؒ طبع دار المعارف مصر ۔
۲۴۔ مقدمہ تحفۃ الاحوذی علامہ عبد الرحمٰن مبارک پوری طبع بیروت ۔
۲۵۔ قواعد التحدیث علامہ جمال الدین القاسمی ۔ طبع مصر ۔
۲۶۔ مقدمۃ ابن الصلاح ۔ علامہ ابن الصلاح ۔ طبع مدینہ منورہ ۔
۲۷۔ امام مالکؒ پروفیسر ابو زہرہ ۔ اردو ترجمہ ۔ طبع شیخ غلام علی لاہور
۲۸۔ حجۃ اللہ البالغۃ ۔ امام شاہ ولی اللہؒ ۔ اردو ترجمہ ۔ اصح المطابع کراچی ۔
۲۹۔ معجم الادباء ۔ یاقوت ۔ طبع عیسی البابی ۔ مصر

معزبی تہذیب کا بحران

نیا سلسلہ مضمون

یورپ —— ایک وسیع پاگل خانہ

جناب ریاض الحسن نوری - ایم اے

(۱)

جناب ریاض الحسن صاحب کے اس سلسلۂ مضامین کو شائع کرتے ہوئے مجھے ایک پہلو سے دلی تکلیف ہوتی ہے کہ مؤلف کو مغرب کے بہت سے گندے حقائق کو بیان کرنا پڑتا ہے یا تاریخ کے کچھ منحوس کرداروں کو بے نقاب کر کے سامنے لانا پڑتا ہے، اور یہ چیز ہم شائع کر رہے ہیں۔ اس کی ضرورت یہ ہے کہ یورپ جس کی مرعوبیت کا طلسم ابھی تک پوری طرح نہیں ٹوٹا اور جس کو اخلاقی لحاظ سے بھی خراجِ تحسین پیش کیا جاتا ہے، اس کے متعلق اہلِ مشرق، خصوصاً ملتِ پاکستان کو، نیز احیائے اسلام کی تحریک میں حصہ لینے والوں کو جاننا چاہیے کہ مغربی زندگی کی خوبصورت جھیل کی سطح کے نیچے کیا گند مچ رہا ہے۔ شائستہ گفتگوؤں، ٹریفک کی باقاعدگی، سیاسی اور سماجی ادارات اور کاروباری تنظیموں کی باضابطگی کے خوشنما لباس میں مرعوب کرنے والے معاشرے کے بدن پر کیسے کیسے مکروہ ناسور ہیں۔ ہر آدمی مغربی اقوام کی تاریخ میں تہذیب کا اتنا مطالعہ نہیں کر سکتا جتنا ریاض صاحب کر رہے ہیں۔ ان کا حاصلِ مطالعہ سوچنے، لکھنے اور بولنے والوں کے لیے مفید معلوم ہوتا ہے۔ (ن۔ ص)

---

[1] میں بڑی عرق ریزی سے مغربی زندگی کی گندگیوں کے بیان کو محتاط ترین لفظوں کا جامہ پہناتا ہوں اور کبھی مشکل الفاظ کو پردہ داری کا ذریعہ بناتا ہوں مگر پھر بھی کہاں تک۔

فرنگیوں کو عطا خاکِ سوریا نے کیا نبیِ عفت و غمخواری و کم آزاری

صلہ فرنگ سے آیا ہے سوریا کے لیے مے و قمار و ہجومِ زنانِ بازاری

اگر آپ مشرق و مغرب کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو بظاہر ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ بیشتر برائیاں یورپ ہی سے چار دانگ عالم میں پھیلیں۔ بلکہ مورخ ٹیلر تو قرون وسطیٰ کے یورپ کو ایک وسیع پاگل خانہ قرار دیتا ہے۔ مگر غور سے دیکھنے پر واضح ہوتا ہے کہ جدید یورپ بھی ایک وسیع پاگل خانہ ہی ہے۔ یہ بات آخیر میں (BENJAMIN WALKER) کے بیان وغیرہ سے عیاں ہو جائے گی۔ ہم رسل کا قول لکھ چکے ہیں کہ آتشک اور تپ دق یورپ نے مشرق میں پھیلائی۔

مغرب میں محرمات کی تذلیل

اس پاگل پن کی داستان کا ایک حصہ انتہا درجے کے تشدد کے علاوہ محرمات کو ہوس کاری کا نشانہ بھی بنانا تھا۔ عیسائیت جیسے پیار اور محبت کے مذہب کا بھی یورپ میں جا کر حلیہ بگڑ گیا۔ یورپ کے لوگ خود تو کیا بدلتے، انہوں نے عیسائیت ہی کو بدل ڈالا۔ یورپ کی وحشی اقوام میں بدکاری ——— اور محرمات کی بے حرمتی ——— عام تھی، بلکہ دیوتا تک اس میں ملوث پائے جاتے۔ جن کے دیوتا ایسے ہوں تو اُن کے پجاریوں کا کیا حال ہو گا ———

(BENJAMIN WALKER) لکھتا ہے کہ یونانی دیو مالا Mythology ہمیں بتاتی ہے کہ کس طرح Uranus دیوتا کے بیٹے نے اپنے باپ کو آپریشن کے ذریعے اس وقت عنین بنا دیا جب کہ وہ اُس کی بیوی یعنی اپنی بہو کو نشانۂ ہوس بنا رہا تھا۔[1]

بائیبل میں دیوتا تو تھے نہیں، اس لیے یورپ کے بزرجمہروں نے اپنے عیوب اور عادتوں کے جواز کی خاطر بائیبل میں تحریف کر ڈالی اور (العوذ باللہ) پیغمبروں کو محرمات سے ملوث دکھا دیا۔ کلام مقدس عہد عتیق کے اسفار تواریخی کا پہلا حصہ تکوین کہلاتا ہے۔ اس کے باب انیس (19) میں حضرت لوطؑ کے متعلق ایسی بیہودہ گوئی کی گئی ہے کہ نقل کرنا مشکل ہے۔

تکوین ہی کے باب نمبر ۳۵ میں حضرت یعقوبؑ یعنی اسرائیل کے بیٹے کے متعلق ایسی گندی بات درج ہے۔

1- 1 P. 53 Sex and the Supernatural by Benjamin Walker.

کتاب مقدس میں پیغمبروں اور ان کی اولاد اور ان کی بیویوں کے متعلق مزید لغو باتیں درج ہیں۔

آج بھی یورپ میں محرمات کو نشانۂ ہوس بنانے کی وبا اندازوں سے بڑھ کر ہے — اس حرکتِ شنیعہ کو پاگل پن کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ اس وبا کا اندازہ اعداد و شمار سے پوری طرح نہیں لگایا جا سکتا۔ کیونکہ Caprio M.D کے بقول محرمات کے ناموس پر حملوں کے کیس، سوائے ان کے کہ جن کو جبری حملوں کا نشانہ بنایا گیا ہو، عدالتوں کے سامنے نہیں آتے۔[1] زیادہ تر فریقین کی رضامندی کے کیس ہوتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود ایک تحقیق کے مطابق جس کا نام "نیویارک سٹڈی" ہے Sing Sing جیل میں جنسی جرائم کے جو مجرم قید تھے ان کی تعداد کل ۱۰۰ تھی اور ان میں سے ۲۳ محرمات سے جبراً ملوث ہونے کے مجرم تھے۔[2]

یہ تو دورِ جدید کا حال ہے مگر یورپ کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ یورپ کے بڑے سے عظیم لوگ بھی اس میں مبتلا نظر آتے ہیں جیسے کہ یہ انتہائی گندی برائی یورپ کی گھٹی میں پڑی ہو۔

حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ | برٹرینڈ رسل لکھتا ہے "بائیبل میں خاندان کے خلاف جو بحث ہے اس پر اتنا غور نہیں کیا گیا جتنا کہ حق تھا۔ چرچ حضرت عیسیٰ کی والدہ کو عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے مگر بائیبل کے الفاظ کے مطابق خود حضرت عیسیٰ ایسا نہیں کرتے۔ والدہ سے تخاطب کا طریقہ یہ ہے:۔

Woman, what have I to do with thee (John ii-4)

اے عورت! میرا تجھ سے کیا واسطہ؟[3]

1- P. 192 Variations in Sexual Behaviour by Caprio M.D.

2- P. 237 The Crime Problem by Walter C. Recless.

3- Why I am not a Christian by Bertrand Russell P. 35

مزید رسل لکھتا ہے کہ عملی لوگوں میں سے جن کو سینٹ Saint تسلیم کیا گیا صرف وہ تھے جنہوں نے اپنی زندگیوں کو زندگیوں کے خلاف لڑنے میں صرف کیا، مثلاً سینٹ لوئس چرچ کسی کو اس بنا پر ہرگز سینٹ نہیں بناتا کہ اس نے فائینس Finance یا کرمنل لا۔ یا عدالتی نظام کی اصلاح ہو۔ انسانوں کی بہتری کی ایسی باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ مجھے یقین نہیں کہ سینٹوں کی پوری لسٹ میں ایک سینٹ بھی ایسا ہو جسے یہ مقام عوام کے فائدے کے لیے کام کرنے پر ملا ہو۔ اخلاقی اور سوشل انسان میں تفریق کی بنا پر جسم اور روح میں تفریق ہو گئی .... میں سمجھتا ہوں کہ عیسائیت کے کئی صدیوں کے دور کا یہ اثر پڑا ہے کہ لوگ زیادہ خود غرض اور اپنے ہی حال میں مست بن گئے ہیں[1]۔

پھر رسل لکھتا ہے کہ کیا ہم انیسویں صدی کے پوپ Pius IX سے ہمدردی کر سکتے ہیں۔ جس نے کہ جانوروں پر ظلم روکنے والی سوسائٹی سے کسی قسم کا تعلق رکھنے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ یہ سوچنا کہ انسانوں پر جانوروں کے بھی کچھ حقوق ہیں[2] کفر ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ پوپ چاہے کتنا ذہین ہو مگر ۱۸۴۸ء تا ۱۹۱۴ء کے مختصر عرصے کو چھوڑ کر ہمیشہ خوفناک اور کریہہ رہا ہے۔ اور اب پھر اسی ڈگر پر واپس آرہا ہے[3]۔

روما کے کچھ حالات روم کے بادشاہوں میں سے شہنشاہ Cladius اور اس کی بیوی کا قصہ سن لیجیے۔

Richard Lewinsohn M D صاحب لکھتے ہیں کہ روما کے تخت کی جنسی بلائیں مرد نہیں عورتیں تھیں۔ ان میں سے ایک مردوں کی دیوانی اور ان کو تباہ کرنے والی میسیلینا Messalina تھی۔ جو مرد اس کی ہوسناکی کو غذا دے دیتا وہ اس کی حفاظت میں آجاتا، اور جو اس کی دعوتِ بد پر لبیک نہ کہتا، اس کو جان سے ہاتھ دھونے پڑتے ...... جب وہ

1- Ibid 34. 35.

۲۔ درود و سلام ہو حضور خاتم النبیین پر جس نے واضح طور پر جانوروں کے حقوق متعین کیے۔ (رفیع ص)

-3- In Praise of Idleness by Bertrand Russell P. 103

شہنشاہ Cladius کی تیسری بیوی بنی تو اُس کی عمر تیس سال تھی اور شہنشاہ کی عمر پچاس کے پیٹے میں تھی۔ جب وہ خلافِ توقع بادشاہ بن گیا تو اُس کی بیوی نے اپنی اتھارٹی قائم کرنی شروع کر دی۔ وہ رومی شرفاء کا خون بہا کر اقتدار پہ قابض ہوئی۔ ایک کو اُس نے اس وجہ سے قتل کرا دیا کہ اُس نے اُس کی طرف التفات نہ کیا، دوسرے کو اس لیے کہ اُسے اُس کے باغ بہت بھا گئے تھے۔ جب وہ رُوم کی اصل حکمران بن گئی تو اُس نے عاشقوں کو پسند کرنے کے سلسلے میں ہر چیز کو بالائے طاق رکھ دیا۔ اُس کے حکم پر سٹیج سے ایک ایکٹر کو اُس کی خواب گاہ کے لیے لایا گیا۔ اُس نے قحبہ خانے میں تجربے کے طور پر کچھ دن گزارے۔ اُس نے وہاں Lysisca کے (فرضی) نام سے تختی بھی حسبِ دستور لگوا دی اور راہگیروں کے لیے اپنے ایوانِ بدن کے دروازے کھول دیے۔ سارا رُوم اُس کی باتیں کرتا مگر Claudius بادشاہ انجان بنا رہا۔ اس پر وہ اور دلیر ہو گئی۔ جب اُس کا خاوند شہنشاہ Ostia میں تھا تو اُس نے اپنے جوان عاشق Gaius Silius کو حکم دیا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ اس کے بعد اُس نے خود اُس سے شادی کر لی۔ اس سے ظاہر تھا کہ اب وہ اُسے بادشاہ بنانا چاہتی ہے۔ جب یہ بات بادشاہ تک پہنچی تو اس کے بعد ہی اُس کو اپنی عزت کا خیال آیا۔ اور بادشاہ نے اُسے قتل کرا دیا۔

اس تجربے کے بعد بھی وہ عورتوں سے الگ نہ ہوا۔ اپنا گھر بسانے کے لیے اب ساٹھ سال کی عمر میں اس نے اپنی Niece (بھانجی یا بھتیجی) Agrippina سے جس کی عمر تیس سال تھی، شادی کر لی۔ اس عورت کا ماضی عجیب تھا۔ اس کے بھائی Caligula نے اُس کے ساتھ ذوّاتی کی زندگی گزارنے کے بعد اُسے گھر سے نکال دیا تھا۔ یہ عورت ہر وقت اس خوف میں مبتلا رہتی کہ کہیں اس سے کم عمر اور زیادہ خوبصورت عورتیں بادشاہ کی منظورِ نظر نہ بن جائیں۔ اس لیے وہ دربار کی اُن عورتوں کو جن کو وہ اپنی ممکنہ رقیب سمجھتی، جلاوطن کروا دیتی یا قتل کروا دیتی۔

پہلے خاوند سے اس کا ایک بیٹا نیرو نامی تھا۔ اُس کو تخت دلوانے کی خاطر اس نے کلاڈیس کے حقیقی بیٹے کو تخت کی وراثت سے محروم کرا دیا۔ جب کلاڈیس زیادہ عرصے زندہ رہا تو

اُس نے اُسے زہر دلوا دیا۔ اُس کی یہ اُمید کہ وہ جیسے کلاڈیس کو قابو میں رکھے ہوئے تھی، ویسے ہی نیرو پہ بھی گرفت رکھے، بر نہ آئی۔ جب وہ نیرو کے لیے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہونے لگی۔ اور میسیلینا کے بیٹے سے مل کر سازش کرنے لگی تو نیرو نے اُسے مروا ڈالا (یعنی اُس ماں کو جس نے اُسے تخت دلایا تھا)۔

اس دور کی مشہور عورت Poppaea تھی جو کہ روم کی ملکاؤں میں Vamo یعنی ڈائن مشہور تھی۔ روم کے تخت پر آنے سے پہلے بھی وہ بہت سے معاشقے کر چکی تھی۔ جب نیرو کی نظر اُس پہ پڑی تو وہ گارڈز کے کمانڈر کی بیوی تھی۔ نیرو کو اسے حاصل کرنے میں بہت سے طریقے استعمال کرنے پڑے۔ پہلے اُسے اُس نے ایک دوست (جو بعد میں شہنشاہ Otho بنا) کے پاس بھیج دیا جہاں اس کا نام کا خاوند بنا دیا گیا۔ اور درحقیقت وہ نیرو کی داشتہ تھی۔ مگر یہ چال کارگر نہ ہوئی۔ کیونکہ Otho نے نیرو کی بیوی میں حصہ دار بننے پر اعتراض شروع کر دیا۔ اس لیے بادشاہ نے اُسے پرتگال کا گورنر بنا کر روانہ کر دیا۔ مگر Poppaea محض بادشاہ کی داشتہ بن کر نہ رہنا چاہتی تھی بلکہ وہ تو ملکہ بننا چاہتی تھی۔

اس دوران شاہ کی ماں یعنی Agrippina نے بادشاہ کی شادی ایک نچلے درجے کی عورت سے کرنے کی مخالفت کی۔ اس سے پہلے تخت دلوانے کے دوران اُس نے نیرو کی شادی Octavia سے کر دی تھی جو Cladius اور میسیلینا کی دختر تھی۔ Octavia اگرچہ بہت فرمانبردار تھی اور اپنی ماں کی طرح سے نہیں تھی۔ مگر پھر بھی چونکہ وہ راہ میں حائل تھی۔ اس لیے نیرو نے اسے طلاق دے کر جلاوطن کر دیا۔ اور جب اُس کے اس سلوک پہ روم کے لوگ اعتراض کرنے لگے تو اُس نے اُسے قتل کرا دیا۔ اب Poppaea کا راستہ بالکل صاف تھا اور وہ صحیح معنوں میں روم کی ملکہ بن گئی۔

نیرو نے اس عورت کے آگے بالکل ہتھیار ڈال دیے۔ جب اُس کے ہاں لڑکی پیدا ہوئی تو بادشاہ خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ اور اُس کو عزت بخش کر Augusta کا درجہ دے دیا۔ پھر جب چند ماہ بعد اُس کی بچی مر گئی تو اُسے تقدس کا مقام دے دیا گیا۔ روما کی مشہور آتشزدگی کے بعد نیرو کو اپنے آپ پر قابو نہ رہا تھا۔ پس جب اُس کی ملکہ دوبارہ حاملہ ہوئی تو وہ بپھر گیا۔

نیرو نے اُسے ایسا دھکا دیا جس کے نتیجے میں بالآخر وہ مرگئی۔ مگر دُنیا کو یہ دکھانے کے لیے کہ وہ اس سے کتنی محبت کرتا تھا اُسے ایسا عزت کا مقام دیا جو کسی رومی ملکہ کو نہ ملا تھا۔ اُس کو دیوی کا مقام دے دیا گیا اور روما کی عورتوں نے فوراً اُس کے نام پر ایک مندر تعمیر کرادیا۔[1]

ایک حالیہ واقعہ نوائے وقت مورخہ ۱۳ اپریل ۱۹۸۰ء میں یہ خبر چھپی ہے کہ فرانس کے صدر نے ایک عورت کو ایک تقریب کے ذریعے ایک ایسے شخص سے شادی کی اجازت دے دی ہے جو تیس سال قبل ہلاک ہوگیا تھا۔ ایسا اس لیے کیا گیا کہ اُس کے دو ناجائز بچوں کو جائز قرار دیا جائے۔ کیا یہ خود فریبی اور پاگل پن نہیں ہے۔

پاگل کس کو کہا جائے گا۔ ایک شخص یا ایک قوم اگر یہ تبلیغ شروع کردے کہ جنسی اغراض کے لیے ماں بہن کو عام عورتوں کی حیثیت دینی چاہیے۔ مردوں کا مردوں اور عورتوں کا عورتوں سے نکاح جائز ہونا چاہیے (اور یہ ہوچکا ہے)۔ پھر دوسروں کو آلۂ استلذاذ بنانے کے لیے سخت اذیتیں دینے لگے تو ایسی قوم یا شخص کو پاگل کے علاوہ کیا کہا جائے۔

(باقی)

1- P P 78-80 A History of Sexual Customs by Richard Lewinsohn M D
World's Greatest Scandles P. 171. Nunneries

رسائل و مسائل

اسلامی قانونِ وراثت پر اعتراض

اور

اس کا جواب

ملک غلام علی صاحب

سوال :- میں یونیورسٹی میں کامرس کا طالب علم ہوں اور مولانا مودودیؒ اور ان کی برپا کردہ اسلامی تحریک کا دل وجان سے معترف اور قدردان ہوں۔ اقتصادیات کے موضوع پر ہمارے ایک استاد نے خطاب کرتے ہوئے اور نظامِ اراضی پر بحث کرتے ہوئے یہ کہا کہ زمین اتنے چھوٹے چھوٹے قطعات میں تقسیم نہیں ہونی چاہیے کہ وہ اقتصادی لحاظ سے غیر مکتفی (UNECONOMIC) ہو جائے۔ اس کے بعد بحث نے یہ رُخ اختیار کر لیا کہ اسلام کا قانونِ وراثت بھی زمین کی تقطیع اور تقسیم در تقسیم کا باعث بن جاتا ہے۔ اس اعتراض کا کوئی اطمینان بخش جواب اُس وقت میرے سامنے نہیں آسکا۔ آپ براہ مہربانی واضح کریں کہ یہ استدلال و اعتراض کس حد تک صحیح ہے، اور اسے کیسے رفع کیا جاسکتا ہے؟ بعض نے یہ دلیل بھی دی کہ اشتراکی نظام میں اسی لیے زمین اور ذرائع پیداوار کو شخصی ملکیت سے خارج کر کے پوری جماعت اور معاشرے کی ملک میں دے دیا جاتا ہے۔ میں اگرچہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہوں اور اسلام کے ہر حکم اور اصول کو بلاچون وچرا تسلیم کرتا ہوں، تاہم اطمینانِ قلب اور معترضین و مخالفین کو جواب دینے کے لیے مزید رہنمائی اور تشفی کا خواہاں ہوں۔

جواب:- آپ کا خط پڑھ کر بڑا تعجب ہوا۔ ایک تو تعجب اس بات پر کہ جو لوگ اسلام کے مخالف ہیں اُن کے اعتراضات کس آسانی کے ساتھ ہمارے ہاں پھیل جاتے ہیں، دوسرا تعجب اس بات پر ہے کہ اس طرح کے اعتراضات کا کوئی صحیح جواب معترضین کو نہیں دیا جاتا۔ حالانکہ ایک مسلمان تھوڑا سا بھی غور کرے تو ان اعتراضات کا جواب وہ خود دریافت کر سکتا ہے اور دوسروں کو دے سکتا ہے۔

اب آپ اسی اعتراض کو لیں کہ اسلام کا قانونِ وراثت اراضی کو تقسیم در تقسیم کرتا ہوا اس کی مقدار کو اقتصادی اعتبار سے معترضین کے بقول غیر کفیل بنا دیتا ہے۔ اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ دُنیا میں جہاں کہیں بھی اس اصول کو تسلیم کیا جائے گا کہ ایک مالک جائز طریق پر زمین یا دوسرے ذرائع پیداوار یا جائیداد کا مالک بن سکتا ہے تو حقِ ملکیت ہی سے یہ بات لازمی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ وہ اپنی اس ملکیت کے جتنے حصے چاہیے اپنی زندگی میں کسی دوسرے کو بالمعاوضہ یا بلامعاوضہ منتقل کر سکتا ہے اور مرنے کے بعد وصیت یا وراثت کے ذریعے سے اس کی املاک بہر حال ایک سے زائد وارثوں یا جانشینوں کی طرف منتقل ہو سکتی ہیں یا پھر یہ قاعدہ بنانا چاہیے کہ کسی زمین یا جائیداد کا جتنا حصہ یا جتنا ٹکڑا کسی کے پاس ہو وہ اتنے کا اتنا ہی کسی دوسرے کی طرف منتقل ہو۔ ورنہ اگر کسی شکل میں بھی تقسیم ہوگا تو کوئی مرحلہ ایسا آجائے گا کہ وہ جائیداد مقدار میں اتنی کم ہو جائے گی کہ وہ ان معاشی ماہرین کے نزدیک (UNECONOMIC) غیر اقتصادی ہو جائے گی۔

اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ غیر اقتصادی شکل کے موہوم خطرے سے بچانے کے لیے مالک کے حقوقِ تصرف پر پابندی لگا دی جائے اور وراثت و تملیک کے بھی حقوق محدود کر دیے جائیں۔ کسی شخص کے پاس دس ایکڑ زمین ہے اور وہ بیچنا چاہے یا کسی دوسری صورت میں منتقل کرنا چاہے تو پورے کا پورا رقبہ منتقل کرے اور اگر وہ مر جائے تو خواہ اس کی بیوی اور بہت سی اولاد ہو اُن میں سے کسی ایک کو وارث بنا دیا جائے اور دوسروں کو محروم کر دیا جائے ورنہ ظاہر ہے کہ ایک کے بجائے اگر دو یا تین لڑکے ہیں اور اُن میں یہ مساوی تقسیم ہو تو پھر وہی صورت پیدا ہو گی۔ مغربی معاشرے میں مدتہائے دراز سے

اور کسی حد تک اب بھی خلفِ اکبر کی وراثت کا قانون (LAW OF PRIMOGENITURE) رائج ہے، یعنی صرف بڑے لڑکے کو وارث بنا دیا جاتا ہے اور دوسرے وارثوں کو ٹرخا دیا جاتا ہے۔ تو کیا انصاف اور مساوات یا دین و اخلاق کا یہی تقاضا ہے کہ برابر کے مستحقین میں سے صرف ایک کو پوری جائیداد دے دی جائے اور دوسروں کو محض اس لیے محروم کر دیا جائے کہ جائیداد مزید تقسیم نہ ہوتی چلی جائے۔

یا پھر اس کا دوسرا حل اشتراکی معیشت نے نکالا ہے کہ قومی ملکیت کے پُر فریب نام پر قوم کے ہر فرد کو اس کی شخصی ملکیت سے محروم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اور قوم کے چند مقتدر افراد کے ہاتھوں میں پوری قوم کے ذرائع و وسائل دے دیے جاتے ہیں۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اشتراکی ملکوں کے مزدوروں اور کسانوں کی معاشی حالت دوسرے مغربی ممالک کے محنت کاروں سے بدرجہا زیادہ زبوں ہے۔ لاکھوں انسانوں کو بے دریغ قتل کیا گیا ہے اور قید و بند میں ڈالا گیا ہے۔ زراعتی فارموں پر کام کرنے والے خود بھوکے مرتے ہیں۔ مگر پیداوار کی جتنی مقدار انہیں پیدا کر کے حکام بالا کے سامنے پیش کرنی پڑتی ہے وہ بہر حال کی جاتی ہے۔ بعض اوقات اُن ماؤں کے بچوں کو پوری خوراک نہیں مل سکتی جو اجتماعی فارموں میں کام کرتی ہیں۔ یہ محض سرمایہ داروں کے الزامات نہیں ہیں بلکہ دُنیا بھر میں شائع ہونے والے اشتراکی لٹریچر میں ان حقائق کا انکشاف کیا گیا ہے۔

اس کے بعد جہاں تک اسلامی یا کسی دوسرے قانونِ وراثت کے خلاف عائد کردہ الزام کا تعلق ہے اس کا نہایت سیدھا اور آسان جواب یہ ہے کہ جو چیز ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہو سکتی یا اُس کا ہونا معاشی یا کسی دوسرے پہلو سے غیر ممکن یا غیر مفید ہے تو اُسے مالک مشترک ملکیت میں رکھ کر اس سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً دس ایکڑ کی زمین میں دس مالکوں کے مالکانہ حقوق پوری طرح محفوظ کیے جا سکتے ہیں۔ اور اُن کے لیے یہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے بجائے اس کی پیداوار کو تقسیم کر لیا کریں۔ ایک وارث اگر چاہے تو اپنا حصہ فروخت کر سکتا ہے اور دوسرا شخص اس کا حصہ خرید سکتا ہے۔ وہ سب چاہیں تو پورا ٹکڑا کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر سکتے ہیں اور اُس کی قیمت فروخت کو آپس میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یہ صورت

(باقی بر صفحہ ۴۷)

مطبوعات

اقبال اور مسئلۂ تعلیم
مؤلف: جناب محمد احمد خاں
باہتمام: اقبال اکادمی۔ پاکستان
۹۰۔ بی۔ گلبرگ ۳۔ لاہور
ضخامت: بڑے سائز کے ساڑھے سو صفحات
معیار: کاغذ اچھا۔ طباعت ٹائپ میں
مجلد مع گرد پوش
قیمت: ۱۷/- روپے

پچھلے دنوں ادارہ معارفِ اسلامیہ کے تحت تحقیقی و تصنیفی کام کے جب نقشے اور گروپ بنائے گئے تو میرا تجویز کردہ ایک عنوان یہ تھا کہ "علامہ اقبال اور مولینا مودودی کی فکری مماثلتیں" اس عنوان کے تحت مسئلۂ تعلیم کو اہمیت حاصل تھی۔ اچھا ہوا کہ آج ہمارے سامنے "اقبال اور مسئلۂ تعلیم" کے موضوع پر ایک ضخیم تالیف موجود ہے۔ جس کے مؤلف بیس سال پہلے ایک کتاب "اقبال کا سیاسی کارنامہ" پیش کر چکے ہیں۔ اور فی الوقت "اسلامی قوانین اور اقبال" کے موضوع پر کام کر رہے ہیں۔

غلام السیدین کی انگریزی کتاب (اقبال کا فلسفۂ تعلیم، مطبوعہ ۱۹۳۶ء) کے بعد اسی راستے پر محمد احمد خاں صاحب نے مزید اقدام کیا ہے۔

اس ضخیم کتاب میں تعلیم کے متعلق نظم و نثر میں بیان کردہ علامہ اقبالؒ کے بیشتر افکار آگئے ہیں۔ اقبال کا مطالعہ یا اقبال کے تعلیمی (خصوصاً) اور دیگر نظریات (عموماً) پر تحقیقی کام کرنے والوں کو اس سے خاص مدد ملے گی۔ مسئلہ تعلیم پر اس کتاب میں اقبال کے اسلامی نظریات کے ساتھ تقابلاً جدید نظریات سے بھی تعرض کیا گیا ہے۔ مگر اچھا ہوتا کہ جدید تعلیمی نظریات پر مواد مرتب کرتے وقت جدید نظریاتِ تعلیم کے ماہرین و فاضلین کا بھی تعاون حاصل کیا جاتا جو آج لاہور ہی کی یونیورسٹیوں میں خاصی تعداد میں موجود ہیں۔

سیکولرازم کی بحث مطالعۂ اقبال کے لحاظ سے بھی، اور علامہ کے تعلیمی نظریات کے لحاظ سے بھی

بڑی اہم ہے۔ میں نے اس حصّے کو ایک نظر دیکھا۔ سیکولرازم کا اصل مقصود لبرلزم ہے، یعنی تمام دینی و اخلاقی تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر اپنی سوچ بچار اور اپنی مرضی سے راستہ متعین کرنا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کوئی سرکش لاڈلا بچہ پوری طرح بگڑ جانے کے بعد والدین، بزرگوں اور بھائی بہنوں کی ہدایت اور مشوروں سے چھٹکارا پانے کے لیے گھر سے بھاگ نکلتا ہے۔ سیکولرازم دراصل ذہنی طور پر یورپ کے بگڑے ہوئے انسان کا مذہب و اخلاق سے فرار ہے، اور مفرور نے جو راستہ اختیار کیا وہ لبرلزم ہے۔ میرا خیال ہے کہ خود لبرلزم پر وسیع گفتگو کی ضرورت تھی۔ خوش قسمتی سے ایسی ایک مفید و تحقیقی بحث اُردو میں وجود پا چکی ہے۔ محمد احمد خاں صاحب کی رسائی اس تک نہیں ہو سکی۔

ولادتِ علامہ اقبال کی صد سالہ تقریبات کی کمیٹی کے پروگرام کے تحت مقررہ وقت پر اتنے اہم موضوع پر ایسی ضخیم کتاب لانے میں جو عجلت برتی گئی ہے اس کا ایک رنگ یہ ہے کہ تحقیقی رنگ زور سے نہیں اُبھرا۔ اور اس سے نمایاں کمی یہ ہے کہ مؤلف کی توضیحی تحریروں میں اس کا اپنا تخلیقی رنگ بھی نمودار نہیں ہوا۔ خصوصاً یہ بات تو عام شارحینِ اقبال کی طرح کی ہے کہ علامہ کے اشعار یا نثر پارے کو لکھنے کے بعد اُن کے طویل ترجمے ساری کتاب میں ملتے ہیں۔ حالانکہ ایک تحقیقی کتاب میں اس کی ضرورت نہ تھی۔ اقتباسات دے کر، یا اقبال کی بعض خاص اصطلاحات کو پیش کر کے اُن پر بحث چھیڑ دینی چاہیے تھی۔ وہ عام لوگ جنہیں نگارشاتِ اقبال کے ترجموں اور تشریحوں کی ضرورت ہے وہ اپنی ضرورت کی کتابیں بازار سے لے سکتے ہیں، بلکہ تحقیقی کار کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ فکرِ اقبال کے کسی پہلو کو اجاگر کرنے کے لیے ایسا طریقِ کار تخلیق کرتا ہے کہ پڑھنے والوں کی ساری توجہ خود اُس کے نکات و معارف پر مرکوز ہو جاتی ہے جو درحقیقت نئے حالات میں خود اقبال ہی کی ترجمانی کا ذریعہ ہوتے ہیں۔

میرے ان مختصر اشارات سے مؤلف یا قارئین کو ہرگز یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اقبال اور مسئلۂ تعلیم کوئی معمولی اور سرسری کتاب ہے۔ اقبالیات میں یہ ایک ایسا اضافہ ہے کہ اسے اساتذہ، طلبہ، مصنفین، صحافیوں، دانشوروں اور ذوقِ مطالعہ رکھنے والے بیدار دل پیر و جوان کو ضرور پڑھنا چاہیے۔

میں اس کتاب کے لکھنے پر محمد احمد خاں صاحب کو اور اقبال اکیڈمی کو مبارک باد کہتا ہوں۔

مسلمان تاریخ نویس
مؤلف: پروفیسر سعید اختر
ناشر: قومی کتب خانہ لاہور
قیمت مجلد ۸/- روپے

پروفیسر محمد سعید اختر بہت سی مفید کتابوں کے مؤلف ہیں۔ بالعموم انہوں نے اعلیٰ درجوں کے طلبہ کی ضروریات کو سامنے رکھ کر خاص خاص موضوعات پر کام کیا ہے۔ لیکن کتابیں ایسی ہیں جو عام دلچسپی کا دامن بھی کھینچتی ہیں۔

پیش نظر کتاب میں سلف کے ۴۳ مشہور مسلم مورخین کے مختصر حالات درج کیے گئے ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ تاریخ سے مسلمانوں کو خصوصی دلچسپی تھی، نیز روایات کو پرکھنے کے اصول بھی انہیں علم حدیث سے ملے۔ اس طرح مسلم مؤرخین کا فن ایک خاص شکل میں پروان چڑھا۔ مؤلف نے خوب کام کیا ہے کہ ان فاضل مؤرخین کے حالات جمع کیے ہیں۔ ان مؤرخین کے کام کے متعلق علماء متاخرین کی آرا بھی اجمالاً درج کر دی گئی ہیں۔

(بقیہ رسائل و مسائل)

گھریلو ترکے، عمارت، دوکان، مال تجارت۔ غرض یہ کہ ہر قسم کی املاک میں اختیار کی جاسکتی ہے بہت سی فیکٹریاں اور لمیٹڈ کمپنیاں ایسی ہوتی ہیں کہ جن میں شخصی ملکیت اور وراثت وغیرہ کے سارے اصول مدنظر رکھے جاتے ہیں، مگر وہ چیزیں اپنی ایک خاص شکل میں نسلاً بعد نسلٍ موجود رہتی ہیں۔ کواپریٹیو فارمنگ اور تعاون باہمی کے اصول پر بھی متعدد مالکان اپنی املاک سے اجتماعی انتفاع کر سکتے ہیں۔

وراثت کا مطلب لازمی تقسیم نہیں ہے۔ وراثت کا مطلب فقط یہ ہے کہ ہر وارث کا حق وراثت محفوظ اور مسلّم ہے۔ بہت سے مالکان یا وارثان چاہیں تو جدید آلاتِ زراعت کو استعمال کرتے ہوئے بڑے بڑے رقبوں کو یکجا انتظام میں رکھ سکتے ہیں، اور ان سے ہر طرح کی پیداوار اور ثمرات حاصل کر سکتے ہیں۔
